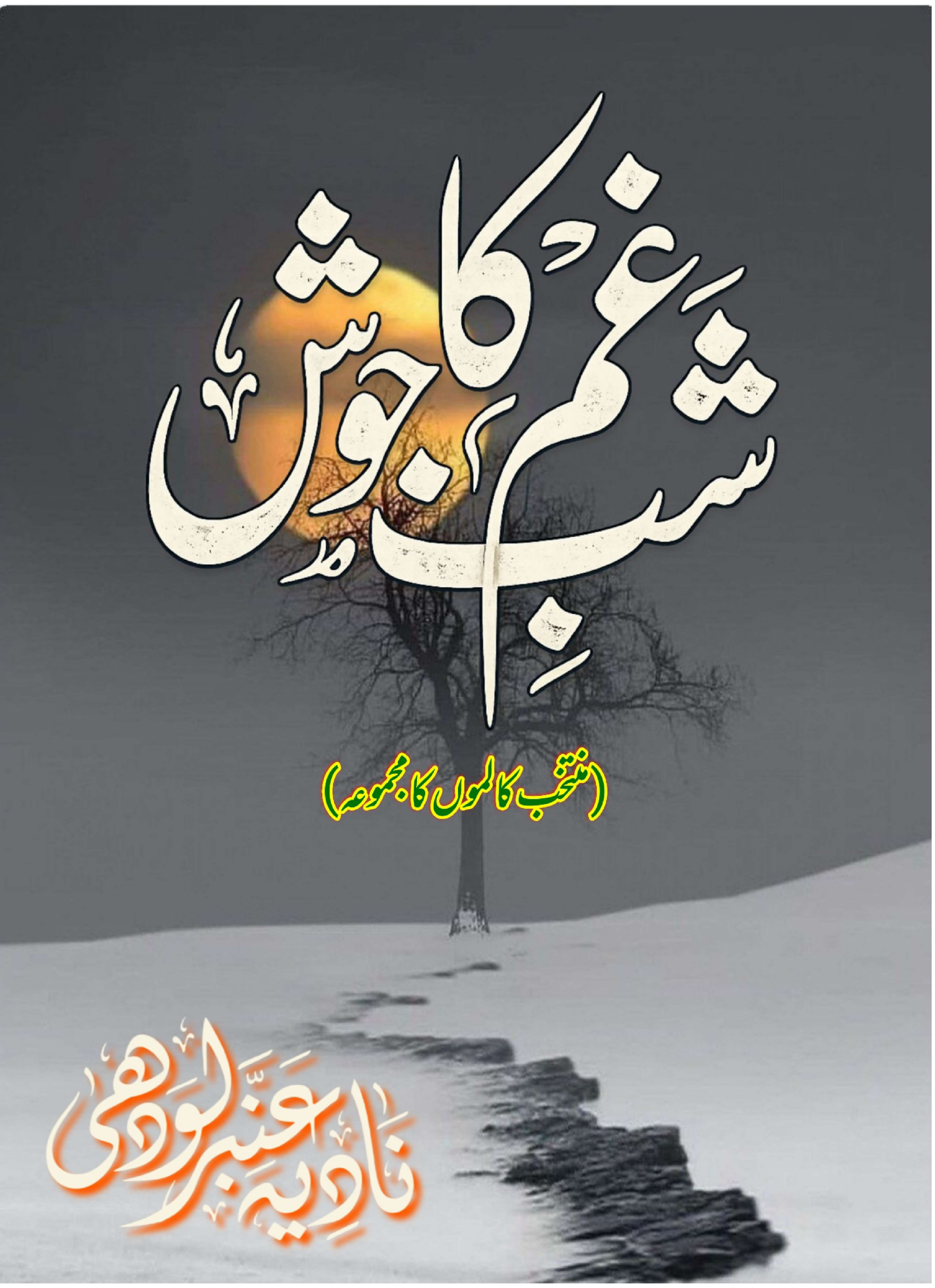
شبِ غم کا جوش
(منتخب کالموں کا مجموعہ)
نادیہ عنبر لودھی

شبِ غم کا جوش

مصنفہ

نادیہ عنبر لودھی

قلم کتاب ای پبلشرز
واٹس ایپ نمبر 03010487501

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: شبِ غم کا جوش

مصنف: نادیہ عنبر لودھی

موضوع: کالم

تزئین و آرائش: محمد عثمان ذوالفقار

کتابت: ابنِ قلم

برقی اشاعت: اپریل 2026ء

سوشل میڈیا انچارج: ماہ رخ شہریار

ناشر: قلم کتاب ای پبلشرز

قلم کتاب ای پبلشرز

واٹس ایپ نمبر 03010487501

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے
(غالب)

انتساب

پیارے بیٹے حارث خان لودھی کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	کچھ اپنے بارے میں	9
2	عائشہ ریاست خان اور خالدہ ریاست	12
3	صادقہ نواب سحر	14
4	ڈانسنگ فلور	19
5	انیس اشفاق......دُکھیارے سے ہیچ تک	21
6	ٹرانسجینڈر رایکٹ اور پاکستانی معاشرہ	26
7	مسوجنسٹ مت بنیئے !	30
8	ڈاکٹر غزالہ خاکوانی	32
9	ہوش بلگرامی کی متنازعہ کتاب ’’مشاہدات‘‘	33
10	زمانہ چال قیامت کی چل رہا ہے	35

11	سیمیں خان درانی کی مبینہ خودکشی	38
12	کماری والا ناول میں ثقافتی سماجی اور ساختی عناصر	42
13	میرا جی اور شونیتا کے تصورات	45
14	مشرف عالم ذوقی کا فکشن تانیثی اور ثقافتی ڈسکورس کے تناظر میں	48
15	استعماریت اور جمہوریت	52
16	فیمینسٹ لکھاری	56
17	ستاروں سے آگے	58
18	کس کی مرضی چلے گی	61
19	ساختیات، پس ساختیات اور ہم	63
20	اینٹ گارے کی کھرچن	65
21	آوے کا آوا	68
22	مادری زبانیں	71
23	جنسی ہراسگی	73
24	آخری صدی کتابوں کی	76
25	بچوں سے جنسی زیادتی	78
26	قبرستان	80

26	1857 ادب اور غالب کے بعد	81
27	عورت	83
28	دجال	86
29	میرا پیغمبر	89
30	عالمی دن	96
31	پردہ	97
32	تیسری جنگ	99
33	زینب اغوا، ریپ، قتل کیس! ذمہ دار کون!	101
34	ذا پختونیم	104
35	پھٹیچر۔ پاکستان کے عدالتی نظام پہ ایک نظر	107
36	شک	109
37	قصہ شعر گوئی کا	111
38	ننھے فرشتے	113
39	اعتبار ساجد	116
40	حج	120
41	مابعد نو آبادیات، شناخت اور استعماری اجارہ داری	125

کچھ اپنے بارے میں

میرے اجداد کا تعلق افغانستان سے ہے۔میرے اجداد 1200ء میں ہجرت کر کے ہندوستان آباد ہوگئے۔افاغنہ جنگجو اور بہادر پٹھان قبائل تھے۔یہ قبائل ہندوستان تجارت کرنے آئے تھے۔یہاں کے حالات کے باعث یہ جنگوں میں شامل ہوئے طاقت حاصل کرتے کرتے دلی کے تخت پر 1451-1526 میں حکمران ہوئے۔پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں شکست کے بعد پٹھان ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے ان میں سے کچھ نے اتر پردیش میں نوابی ریاستیں قائم کی۔کچھ مغلیہ دربار میں اعلی عہدوں پر فائز ہوئے

جب نئی سیاسی حد بندیاں قائم ہوئی تو میرے دادا محمد یسین خان لودھی ولد محمد علی خان لودھی جالندھر،انڈیا سے ہجرت کر کے فیصل آباد پنجاب، پاکستان میں اپنے وسیع خاندان کے ساتھ آ کر آباد ہو گئے۔میرے والد کی پیدائش پاکستان میں ہوئی۔والد نے ائیر فورس میں ائیر ونیٹیکل انجنیئر کے طور پر شمولیت اختیار کی۔1971 کی جنگ لڑی اور ڈھائی سال آگرہ کے جنگی کیمپ میں جنگی قیدی رہے۔والد اور والدہ 1976 میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔والدہ کے والد میرے نانا شفیع خان لودھی ولد اسماعیل خان لودھی لدھیانہ انڈیا سے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے فیصل آباد آ کر آباد ہوئے۔نانا تعلیم نسواں کے حامی تھے۔والدہ شادی سے پہلے سرکاری ملازمت کرتی تھی۔چونکہ والد ائیر فورس میں تھے یہ ہی وجہ ہے کہ میرا اور میرے تین بہن بھائیوں کا بچپن پاکستان کے مختلف بیسز پر مختلف شہروں میں گزرا۔ والد کی پوسٹنگ کی وجہ سے والدہ نے ملازمت

چھوڑ دی اور کچھ عرصہ بعد دینی رجحان کے باعث جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔

پہلا قطرہ

میں ہوں بارش کا پہلا قطرہ پیاسی زمین پر
اپنے اجداد کی روایات کے برعکس
اک آواز جنون
دل کی زمین پر
پانی ہمیشہ اپنا راستہ خود بناتا ہے
قطرہ قطرہ رس رہا ہو
یا آبشار کی صورت گر رہا ہو
میں نے بھی بنایا ہے
بنجر سوکھی ہوئی زمین پر
اپنا رستہ
آہستہ آہستہ
قطرہ قطرہ
(نادیہ عنبر لودھی)

ہمارے گھر میں کتب بینی کا ذوق پایا جاتا تھا۔ والدہ نے ادب اطفال کے رسالے لگوا رکھے تھے۔ غیر نصابی کتب پڑھنے کا رجحان یہی سے شروع ہوا۔ والد نے پچیس سال ائیر فورس میں ملازمت کی۔ والد کی طرح میرے بھائی نے بھی افواج پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ اور وہ اس وقت آرمی میں بریگیڈئیر کے عہدے

پر فائز ہے۔والد نے ریٹائیرمنٹ کے بعد کاروبار شروع کیا اور بزنس ایمپائر قائم کیا۔میری شادی دوران تعلیم کردی گئی تھی ۔شادی کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے اردوادب وزبان میں ماسٹرز کیا۔لکھنے کا آغاز اسکول کے زمانے سے کیا۔ساتویں جماعت میں پہلا شعر کہا۔آغاز شاعری سے کیا نظمیں،غزلیں کہی۔نثر نگاری کی طرف رجحان بعد میں ہوا۔2016 میں برطانیہ کے اخبار''خبریں مانچسٹر یو کے'' سے ریذیڈنٹ ایڈیٹر اسلام آباد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ملکی اور غیر ملکی اخباروں میں کالمز اور مضامین لکھے۔افسانے لکھے۔پاپولر فکشن میں کہانیاں لکھی۔ سیارہ ڈائجسٹ ، سچی کہانیاں ڈائجسٹ ، سرگزشت ڈائجسٹ ، نئے افق ڈائجسٹ ، ڈر ڈائجسٹ، حکایت ڈائجسٹ وغیرہ میں کہانیاں لکھی۔ناول لکھے اور مزید لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔زیر نظر کتاب شبِ غم کا جوش ان کے منتخب کالموں پر مشتمل ہے جو ملکی اور غیر ملکی اخباروں میں چھپ چکے ہیں۔ان اخباروں میں لندن ٹائمز یو کے،خبریں مانچسٹر یو کے، دنیا نیوز اور جڑواں شہروں کے اخبارات شامل ہیں۔

آپ کی آراء کی منتظر

نادیہ عنبر لودھی

اسلام آباد۔پاکستان

nadiaumberkhanlodhi@gmail.com

03215678089

ے

عائشہ ریاست خان اور خالدہ ریاست

(معروف اداکارہ عائشہ ریاست خان)

اتر پردیش ہندوستان میں آباد اردو اسپیکنگ پٹھان جن کے اجداد افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ ان پٹھانوں نے اپنی شجاعت اور بہادری سے حکومت میں اعلی عہدے حاصل کیے اور کچھ نے نوابی ریاستیں بھی قائم کیں۔ ایسا ہی ایک گھرانہ تھا رعب دار حمید اللہ خان صاحب کا۔کون جانتا تھا حمید اللہ خان جن کا تعلق اتر پردیش انڈیا سے ہے ان کی پوتیاں اداکاری کے میدان میں اپنا لوہا منگوائیں گی۔

حمید اللہ خان کا تعلق اردو اسپیکنگ پٹھان (افغان) خانوادے سے تھا۔آپ کا بیٹا ریاست اللہ خان 1914 میں پیدا ہوا۔ ریاست اللہ خان نے پولیس سروس اختیار کی تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان میں پولیس کے اعلی عہدوں پر ملازمت کی۔ ریاست اللہ خان دراز قد، سرخ سفید اور شاندار انسان تھے آپ کی اہلیہ ''امیر جہاں'' انتہائی سلجھی ہوئی شائستہ اطوار کی مالک خاتون تھیں وضع دار اور رکھ رکھاو والی خاتون جیسی کہ اردو اسپیکنگ گھرانوں کی خواتین ہوا کرتی ہیں۔آپ کے 9 بچے تھے جن میں دو بیٹے راحت اللہ خان، خالد اللہ خان اور سات بیٹیاں تھیں جن میں عائشہ ریاست، طاہرہ ریاست، سائرہ ریاست، فردوس ریاست عذرا ریاست اور خالدہ ریاست اور دیگر کے نام شامل ہیں۔ایس پی ریاس اللہ 1981 میں وفات پا گئے۔

عائشہ ریاست 1941 میں متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد آپ کا گھرانہ پاکستان کراچی آکر آباد ہو گیا۔عائشہ ریاست نے کراچی یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔

عائشہ ریاست نے ریڈیو پاکستان سے اپنے فن کا آغاز کیا پھر ptv پر ڈرامہ سیریل میں اعلی اداکاری

کے جوہر دکھائے ۔آپ کا شستہ اردو بولنے کا انداز اور عمدہ انداز نشست و برخاست ناظرین کے دل موہ لیتا تھا۔آپ شکل وصورت اور قد کاٹھ میں اپنے والد سے مشابہ تھیں۔سرو قامت ،خوش شکل اور دلکش سراپا۔

آپ کے مشہور پی ٹی وی ڈرامہ سیریل میں افشاں ،عروسہ، فیملی 93 اور مہندی بہت مشہور ہوئے پرائیوٹ چینلز سے بھی آپ نے کئی ڈرامہ سیریل کیے ۔ان ک تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور اقساط کی تعداد تقریباً سو سے زیادہ ہے۔ ٹیلی فلمز اور فلمز اس کے علاوہ ہیں۔آپ باصلاحیت اور منجھی ہوئی فنکارہ تھیں ۔آپ کی شادی ڈی ایس پی وجاہت لطیف کے ساتھ ہوئی ۔آپ کے دو بیٹے احمد لطیف اور محمد افضل لطیف ہیں ۔ آپ کے بڑے بیٹے محمد افضل لطیف ایکس چیئرمین سی ڈی اے اسلام آباد اور اس کے بعد سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ رہ چکے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ممبر، فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی پوسٹ پر کام کر رہے ہیں اور ایک بیٹی عالیہ لطیف ہے جو کہ نوے کی دہائی کی سپر ماڈل bibi کہلاتی ہے۔

آپ نے 1981 میں ڈرامہ سیریل افشاں کیا۔اور آخری ڈرامہ سیریل 2019 میں " بھروسہ پیار تیرا " میں کام کیا۔اس کے بعد آپ کی صحت خراب رہنے لگی۔گھٹنوں کا درد بڑھ گیا۔13 جون 2025 کو آپ کراچی گلشن اقبال بلاک 7 میں وفات پا گئی ۔ عائشہ خان کو والد کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔عائشہ خان کی سب سے چھوٹی بہن جو کہ گھر میں منی کے نام سے جانی جاتی تھی ۔خالدہ ریاست تھی ۔1953 میں کراچی میں پیدا ہوئی۔خالدہ نے بہترین تعلیمی اداروں سے علم حاصل کیا۔خالدہ نے 1975 میں ایک محبت سو افسانے سے فنی کیرئیر کا آغاز کیے۔کئی ڈرامہ سیریل میں کام کیا جن میں بندش ،نمدار، دھوپ دیوار ،سلور جوبلی ،تعبیر، پڑوسی اور کئی ٹیلی فلمز شامل ہیں۔انکے دو بیٹے رضا فیصل اور علی فیصل ہیں۔

اپنی جاندار اداکاری کی وجہ سے اسی اور نوے کی دہائی میں پی ٹی وی پر راج کیا۔کینسر کے مرض کا شکار ہو کر 1996 میں وفات پائی اور سخی حسن قبرستان میں والد اور والدہ کے قریب مدفون ہو گئیں ۔دونوں بہنیں بہترین فنکارہ تھیں دونوں نے بہت شہرت حاصل کی ۔آپ دونوں کا اعلی تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق تھا۔ جہاں روایات اور اقدار کی پاسداری کی جاتی ہے۔آپ کے عزیز و اقارب کا شمار معاشرے کے سلجھے ہوء باشعور افراد میں کیا جاتا ہے۔اللہ تعالی دونوں بہنوں کے درجات بلند فرمائے آمین ۔

صادقہ نواب سحر

سماجی تذکیریت کے تناظر میں ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا''

پدری معاشرے میں سماجی تذکیریت کے رجحانات ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔عورتوں پر تشدد مردانگی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔صنفی امتیاز، جنسی استحصال، جنسی زیادتی، قتل وغیرہ جیسے الفاظ عمومی نوعیت اختیار کر چکے ہیں ان میں سنسنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی دلخراش واقعہ سامنے آتا ہے۔تذکیریت کی رو سے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کا مطالعہ کیا جائے تو مردوں کے کردار حاوی نظر آتے ہیں۔تذکیریت جیسے منفی رجحان کا عادی ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ خواتین کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہا ہے اسی کی ایک جھلک اس ناول میں نظر آ رہی ہے۔ناول نگار صادقہ نواب سحر کے اب تک تین ناول، افسانوں کے دو مجموعے، شاعری کے پانچ مجموعے، ڈراموں اور مضامین کا ایک ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔یہ ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسے پاکستان میں بھی شائع کیا گیا اور اس کا ہندی، تیلگو اور مراٹھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔صادقہ نواب سحر نے اس ناول میں ایک عام عورت کی کہانی بیان کی ہے ناول کا بیانیہ بالکل سادہ ہے کسی قسم کی سنسنی، تحیر اور سسپنس کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔سادہ نثر جس میں الفاظ کی کوئی پُرکاری نہیں ہے بین السطور کوئی کہانی نہیں ہے ایک عام مشرقی لڑکی جس کی زندگی کا آغاز صنفی امتیاز سے ہوتا ہے شعور آنے پر یہ فرق اس کے ذہن میں نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے اپنوں سے ملی نفرت متاشا کو جھوٹ بولنا سکھا دیتی ہے اپنا گھر اسے ''پھٹکار گھر'' لگتا ہے پھر منہ زور حیوانی جبلت کے سامنے وہ لڑکی بے بس ہو جاتی ہے اور موریشور کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے۔اسکے بعد معاشی جدوجہد میں حصہ لیتی ہے متاشا کا اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر اپنی ماں اور دادی کے ساتھ علی گڑھ اپنے چھوٹے کاکا کے پاس

جانا، زندگی کی معاشی تگ و دو میں ماں بیٹی کا نوکری کرنا، کا کا کا متاشا پر بری نظر رکھنا اس کے جنسی استحصال کرنے کا ارادہ رکھنا، علی گڑھ چھوڑ کر چھوٹے بھائی پرساد کے ساتھ ایئر ہوسٹس بننے کا خواب لیکر ممبئی چلے جانا ،نوکری کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا ریلوے پلیٹ فارم پر راتیں بسر کرنا۔ اِن نامساعد حالات کا مقابلہ متاشا بڑی ہمت اور حوصلے سے کرتی ہے لیکن وہ اندر سے ٹوٹتی چلی جاتی ہے وہ اپنی عمر سے دوگنی عمر کے مرد جو کہ، پانچ بچوں کا باپ گوتم ہے اس سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے۔ جب وہ علی گڑھ واپس آ تی ہے اور اپنے فیصلے اس گھر والوں کو آگاہ کرتی ہے تب اُس کا بھائی گوپی اِس شادی کی مخالفت کرتا ہے۔ یہاں ناول نگار نے اِس شادی کے خلاف بھائیوں کی ذہنی کشمکش کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔آہستہ آہستہ اس کی زندگی جوانی کے دور سے گزر کر بڑھاپے تک آ پہنچتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار متاشا نے اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کی ہے۔فنی اعتبار سے یہ ناول خودنوشت سوانح کی ہئیت میں بیانیہ وصف میں لکھا گیا ہے۔ناول کے آغاز میں متاشا نے اپنے پر دادا کے پردادا کا ذکر کیا ہے جو بہت بڑے شاستری تھے۔ مندر میں پجاریوں سے بھی اونچے عہدے پر تھے اور انھیں راجا کے دربار میں بھی مقام حاصل تھی۔ ان کا لباس سونے کے تاروں اور ہیرے موتیوں سے بنا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے نے اپنی پسند سے کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہ لڑکی ہندو مذہب کے مطابق خود کو نہ ڈھال سکی بلکہ وہ تو چوکھٹ پھلانگنے سے پہلے ہی بیزار ہوگئی۔ ان کا بیٹا" درگا پرساد" شادی کر کے پہلی بار گھر آیا تو شاستری ''جگد ما پرساد'' نے اپنی شریک حیات کو دونوں پر گوبر اور پانی چھڑ کنے کا حکم دیا۔تا کہ بہو شدھ ہو جائے ۔وہ انگریز لڑکی گھبرا کر بگھی میں واپس جا بیٹھی اور ساتھ میں درگا پرساد بھی۔

اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بہو نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر گرجدار آواز سنائی دی۔ رک جاؤ۔ پہلے ان پر گوبر پانی ڈالو پھر لاؤ۔ ماں اس کے سر پر چہرے پر، فراک پر تیزی سے پانی چھڑ کنے لگیں۔انھیں بڑی جلدی تھی، کہیں موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے لڑکی نے جھک کر فراک پر دیکھا۔انگلی سے چھو کر باس لی۔ناک سکوڑی۔ چھی... ای... ای کا وَ ڈنگ۔''

اس اقتباس کا بظاہر تو متاشا سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس کے دادا پردادا کے زمانے کا واقعہ ہے لیکن بتانا

مقصود یہ ہے کہ ناول نگار نے دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کو کس خوبی سے پیش کیا ہے بہر کیف اس شادی کے بعد جو نسل وجود میں آئی وہ نہ تو پوری طرح برہمن تھی اور نہ ہی کرسچن بلکہ ایک Mash-up تھی، لیکن براہمن گوتر کی پاسدار تھی۔ دوسری طرف متاشا کے نانا کے پرنانا قنوج کے برہمن تھے اور زمین دار بھی۔ اس زمانے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی جس کا اثرات پرنانا پر بھی ہوئے۔ متاشا اپنی پیدائش پر والدین کے منفی رویے کا ذکر کرتی ہے خاص طور پر والد نے کئی دن تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ ماں کے ناروا سلوک اور والد کی لاتعلقی کے درمیان پلتی متاشا کو دادی کی محبت بھری گود ملتی ہے۔ متاشا کی خوبصورتی مردوں کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے لیکن وہ مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے جس کی وجہ صفحہ ۵۳ پر متاشا کی عصمت دری کا واقعہ ہے وہ بھی اس کے پڑوس کے موریشور کا کانے کیا جس میں اس کے والد کی رضامندی شامل تھی۔ خود کو مردوں سے بچاتے متاشا جوانی کے دن گزارنے لگی لیکن معاشی جدوجہد سارے کنبے کے حصے آئی اسی جدوجہد نے متاشا کو ہندوستان کے کئی شہر دکھائے جن میں بن متر پور، رڑکیلا، کولکاتہ، علی گڑھ اور ممبئی بطور خاص ہیں۔ متاشا کی زندگی میں کئی مرد آئے لیکن جس نے بھی نظر ڈالی بری نظر ڈالی متاشا نے ایک شادی شدہ مرد سے شادی کر لی جو کہ متاشا سے عمر میں ۲۲ سال بڑا اور پانچ بچوں کا باپ تھا۔ متاشا اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہے اور بڑے ہی سلیقے سے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتی ہیاور ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے شوہر کے انتقال کے بعد متاشا کی زندگی پھر بے سکون ہو جاتی ہے وہ سوتیلے بیٹے کے رحم و کرم پر آ جاتی ہے۔ اور اس کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ ’’میں جتنی بار بھائیوں کے پا بھاگ کر جاتی کتے کی طرح ذلیل ہو کر لوٹ آتی۔‘‘

ایک بیوہ عورت کی مجبوریاں اور آزمائشیں متاشا کے کردار میں مجسم ہو کر سامنے آتی ہے وہ کہتی ہے

’’دو سال تکلیفوں کے گذر گئے۔ انکت (سوتیلا بیٹا) کی دست درازی بھی بڑھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ اکیلا ہوتا اور میں دکھائی دیتی وہ گندی سی نظر سے مجھے سر سے پیر تک گھورتا۔ برتن لیتے دیتے وقت ایک گندا ساانچ میں ہمیشہ محسوس کرتی۔ مجھے گوتم بہت یاد آتے۔‘‘

سوتیلے بیٹے انگت کی دست درازیوں اور جسمانی تشدد سے تنگ آ کر وہ دیپو کو لے کر پہلے منالی اور پھر

اڑیسہ چلی جاتی ہے۔ایسی در بدری میں دیپو کی پرورش بھی اچھے طریقے پر نہیں ہو پاتی۔وہ اپنی ماں پر ہو رہے ظلم وستم کو دیکھتے ہوئے جوان ہوتا ہے۔وہ پڑھائی چھوڑ کر کام کاج کر کے ماں کا ہاتھ تو بٹانے لگتا ہے لیکن بے راہ روی کا شکار ہو کر غلط راستے پر چل پڑتا ہے۔نونیتا نامی لڑکی سے اسے محبت ہو جاتی ہے جس کا ثمر شادی سے قبل نونیتا کے ماں بننے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔دیپو نونیتا سے اناڑن کروانے کا کہتا ہے لیکن دیر ہو چکی ہے۔

ناول کا آخری حصہ سماج کی ایک نئی برائی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس میں سماج کے اکثر طبقے مبتلا ہو چکے ہیں اور اسے ریلیشن شپ کا نام دیا گیا ہے۔ایسے تعلقات کے نتیجے میں حمل، اسقاط حمل ہوتے ہیں۔ ناول کے اختتامیہ باب میں متاشا دیپو کے بچے کو اپنانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ایک امید کی کرن مایوسی کے اندھیرے میں جھلملانے لگتی ہے۔

ے

باوجود

مرا سوال دوسرا تھا تم نے کیا سمجھ لیا
میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی
جس کی چال میں لچک تھی جس کے ہونٹ پہ ہنسی...
تم آرزو کے محل کی دیوار سے لگے ہوئے
کھڑے تھے میری زندگی کی ڈور سے جُڑے ہوئے
میں آنکھ بھر کے دیکھتی تمہیں
تو پوچھتی کہ تم نے ڈور کیوں ہے تھام لی
مگر نظر جو آئے تم تو آنکھ کب اُٹھی مری...؟
جھکی نظر سے میں نے یہ کہا کہ میں وجود ہوں

تمہاری زندگی کی اُلجھنوں کے باوجود ہوں

میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی

تمہارے لوہے کے محل کی زنگ سے بھری ہوئی

رنگ کا غلاف اوڑھے شان سے تنی ہوئی

گلی میں مجھ کو چھوڑ کر

وجود کی تلاش میں نکل نہ جاؤ تم کہیں......!

(صادقہ نواب سحر)

ناول کی کہانی ہمارے سماج کی ایک عام عورت کی کہانی ہے جس کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہوئے گزرتی ہے۔ جو کہ سماجی دباؤ کا شکار ہوتی ہے ناول نگار نے حساس موضوعات کا احاطہ سادگی اور خوبصورتی سے کیا ہے

ڈانسنگ فلور

جب ڈانسنگ فلور پر پاؤں ناچتے ہیں اور جسم تھرکتے ہیں ۔تو راجاؤں ، مہاراجاؤں اورنوابوں کے درباروں کی شان یاد آجاتی ہے جہاں گانے ،ناچنے والیاں طوائفیں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مجرا کیا کرتی تھیں ۔دربار میں لگی ہوئی شاہی کرسیوں پر بیٹھے درباری یہ تماشا دیکھا کرتے تھے۔شادی بیاہ کی تقریبات میں نواب طوائفوں کو بلوایا کرتے اور انکے رقص سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ان طوائفوں کوانعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ان میں سے کچھ دربار سے منسلک ہوجاتی تھیں اوران کا روزگار لگ جاتا تھامغل حکمرانوں کے بعد جو حکمران آئے انہوں نے ان طوائفوں سے مال ودولت نکلوانے کے لیے(جوان طوائفوں نے بہت محنت سے ناچ کراور گانے سنا کر جمع کیا تھا) بہت حربے آزمائے ۔اسی سوچ کے تحت 1857 میں ان طوائفوں کوبھی غدار قراردے دیا گیاان کے کوٹھے غیر آباد ہوگئے یہ قسمت کی ماریاں جان بچا کردوسرے شہروں میں بھاگ گئی کچھ ماری گئی ۔کچھ کوغلام بنالیا گیا۔ نئے حکمرانوں کے دورحکومت میں ایک دفعہ وائسرائے نے سرسیداحمدخان سے کہا تھا کہ میری بیگم آپ کی بیگم سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں جس پر سرسیداحمدخان نے فرمایا۔’’ہماری خواتین کا بھی آپ کی خواتین سے پردہ ہے۔‘‘

اس مسلم قوم کی خواتین کا آج یہ عالم ہے دوپٹہ ناپید ہوگیا ہے۔اذان کے وقت دوپٹہ سر پر لینے کی روایت دم توڑتی جارہی ہے۔عورت نے دوپٹے کواضافی بوجھ سمجھ کراتار پھینکا ہےفی زمانہ دوپٹہ جاہل یاغریب ہونے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔دلہن کی والدہ جوکہ دلہن کی تربیت کیا کرتی تھیں گھر گرہستی کے ہنر سکھایا کرتی تھی آج وہ ناچ گانے کی تربیت کا آغاز شادی سے ایک ماہ پہلے شروع کردیتی ہیں ۔جن کی گود میں نسلیں پرورش پاتی ہیں ۔انہیں شعور ہی نہیں ہے کہ نکاح کا مقصد کیا ہے۔1857 کے بعدطوائفوں کا اپنے جسم کی نمائش سے پیسہ کمانے کافن وقتی طور پرزوال کا شکار ہوگیا پھر ہندوستان میں سینما آیا۔فلمیں بننے لگی تو ان

طوائفوں کے دن بھی پھر گئے یہ اداکاری کے جوہر دکھانے لگی۔اب فلمی ہیروئینوں کو دولت مند رئیس شادیوں میں بلانے لگے اس طرح ان کے فن کی قدر ہونے لگی اور روزی روٹی بھی چلنے لگی۔پھر سماج نے نئی تہذیب کو روشناس کروایا شادی ہال میں ڈانسنگ فلور بن گئے مہندی کے نام پر جو کہ مسلمانوں کی رسم ہی نہیں ہے۔ان ڈانسنگ فلورز پر اصل حسب نسب والی خاندانی شریف پڑھی لکھی خواتین اور نوجوان لڑکیاں ناچنے لگی اب داد دینے والے ان کے باپ، بھائی،شوہر،خاندان کے افراد اور نئے سسرالی رشتہ دار ہوگئے۔شرم وحیا کا جنازہ نکل گیا۔دلہن جس کا تصور شرم وحیا سے وابستہ ہے۔وہ ناچنے لگی اور اس کا ساتھ اس کی کزنز دینے لگے جن میں لڑکے لڑکیاں شامل ہیں۔دلہا دلہن کپل ڈانس کرنے لگے۔دلہن کے والدین اور دیگر رشتہ دار بھی اس کار خیر میں حصہ ڈالنے لگے۔دوسری طرف لڑکے کی شادی ہے تو ادھر بھی یہ ہی صورت حال ہے۔

افسوس کا مقام یہ نہیں ہے کہ حیا کا جنازہ نکل گیا افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ ہم تیزی سے اسلامی اور مشرق روایات کو بدل رہے ہیں۔شادی کی رسومات اب دس دن تک چلتی ہیں ڈھولکی کے نام سے شروع ہونے والی یہ خرافات مایوں اور دیگر رسومات کے نام پر وقت اور پیسے کا زیاں ہے۔نکاح مسجد میں کیا جاتا ہے جہاں خواتین بن سنور کے بے پردہ ہو کر فوٹو سیشن کرواتی ہیں۔یہ کیا نکاح کا اسلامی طریقہ ہے؟

جس قوم میں سے غیرت نکل جائے اس قوم میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ہندوستان پر مغلوں کا اقتدار اس دن ہی ختم ہو گیا تھا جس دن ”غلام قادر روہیلہ“ نے دہلی کے دربار خاص میں بادشاہ وقت ”شاہ عالم ثانی“ کی آنکھیں نکلوادیں او مغل شاہزادیوں کو ناچنے کا حکم دیا تھا۔جس کی تعمیل کی گئی۔

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اسلام دشمن عناصر کے حملوں میں سے سب سے زیادہ سخت حملہ یہ ہے کہ "وہ آپ کو اپنے جیسا بنالے"۔

مسلمان اپنی تہذیب، روایت، اسلامی تشخص عقیدہ، نظریہ سب تبدیل کرلے۔طرز فکر سے طرز زندگی تک سب غیر کی تقلید کے تابع ہو جائے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس تیزی سے معاشرے کی اقدار اور روایات بدل رہی ہیں اگلے چند برس میں ہم کہاں کھڑے ہونگے۔

انیس اشفاق......دُکھیارے سے ہیچ تک

انیس اشفاق کا ناول نگاری کا فن ماضی پرستی ،قدامت پسندی اور لکھنؤ تہذیب کی عکاسی کا نمائندہ ہے انیس اشفاق افسانہ نگار شاعر اور نقاد ہیں چار ناولوں کے مصنف ہیں پیشے کے لحاظ سے استاد ہیں شعبہ تعلیم سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

انیس اشفاق نے 2014ء میں دکھیارے ناول لکھا جسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی اس ناول پر اخبار ڈان میں انتظار حسین نے تبصرہ نما مضمون بھی لکھا۔ یہ ناول سوانحی رنگ لیے ہوئے ہے اس کی اہم کرداروں میں بڑے بھیا، ماں، منجھلے بھیا خود مصنف، سائرہ شمامہ، نواب آغا، حکیم وغیرہ شامل ہیں۔ بڑے بھیا بچپن سے دماغی خلل میں مبتلا ہیں مزاجاً متلون مزاج ہیں۔ٹک ک کام نہیں کر سکتے پھر ماں کی وفات کے بعد گھر سے چلے جاتے ہیں اور یہاں وہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔مصنف نے امام باڑوں اور پرانی حویلیوں کو بھی شاملِ ناول کیا ہے۔لکھنو کی مٹتی ہوئی تہذیب اور نوابوں کی جاتی ہوئی جاہ وحشمت جیسے عناصر کو ملا کر ناول کی بُنت تیار کی گئی ہے۔بڑے بھائی امام باڑوں کی صحنچیوں میں رہنے لگتے ہیں۔ بیمار ہو جاتے ہیں اور ایک دن وفات ہو جاتے ہیں یہی پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔ناول کی فضا اداسی کا گہرا تاثر لیے ہوئے ہے یہ اداسی افراد کے اندر بھی ہے اور مجموعی معاشرتی فضا میں بھی۔ناول کے کردار معاشرے میں رہنے والے عام افراد ہیں ۔جو مختلف مسائل ومصائب کا شکار ہیں۔

جزیات نگاری میں انیس اشفاق صاحب کو کمال حاصل ہے۔انیس اشفاق کا دوسرا ناول خواب سراب ہے "جس میں فلیش بیک کی تیکنیک استعمال کر کے تکنیکی تجربہ کیا گیا ہے۔اس ناول میں بین المتونیت، فنی مخلوطہ (پیسٹج) خط کی تکنیک، شعور کی رو، تاریخی بیانیہ (ہسٹو ریوگرافک میٹا فکشن)، جادوئی حقیقت نگاری، زمانی انتشار (ٹیمپورل ڈسٹورشن وغیرہ کے تجربات کیے گئے ہیں یہ ایک تخلیقی بیانیہ ہے۔

یہ ناول مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا سیکوئیل ہے یعنی تسلسل ۔علی حیدر شمیلہ، سبیلہ، سردار جہاں، جہاں دار بیگم، سلیمن ، ہنگا، کمو، تقیہ بیگم، حکیم احمد رضا وغیرہ ناول کے کردار ہیں۔

ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''کربلائیں، درگاہیں، مسجدیں، امام باڑے، باغ، روضے، سیرگاہیں اور محل سرائیں میں انہی میں زندہ ہوں اور میرا نام لکھنؤ ہے۔''

اس ناول خواب سراب کا مرکزی کردار علی حیدر مرزا ہادی دسوا کے ناول امراو جان کے غیر مطبوعہ مسودے کی تلاش کی کوشش میں سرگرداں ہے اور اس کی اتلاش کے نتیجے میں امراؤ جان ادا اور فیض کی بیٹی کے بارے میں معلومات ملتی ہے اور امراؤ کی اگلی نسلوں کا پتہ چلتا ہے۔ پھر ان کرداروں یعنی شمیلہ خانم اور سبیلہ خانم کی کہانی ناول میں شامل ہوجاتی ہے۔ لکھنؤ تہذیب کا زوال اس ناول کا بنیادی تھیم ہے۔طوائفیں مٹتی ہوئے تہذیب، انہدام ہوتی حویلیاں، اونچے طبقے کے افراد خصوصا خواتین کے مسائل بیا کیے گئے ہیں۔

یہ ناول متن پر متن تخلیق کرنے کی عمدہ روایت ہے۔اس ناول میں نسوانی کردار چھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تانیثیت کی رو سے بھی یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔معاشرے میں خواتین کے کرداروں کو نسل در نسل ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔علی حیدر کی محبت میں مبتلا خواتین کے جذبات ، بڈھی ٹھڈی بیگمات کے احساسات وغیرہ ناول کو رومانیس کی میٹھی کسک سے دوچار کرتے ہیں۔ناول کو ناول نگار نے خاصی عرق ریزی کے بعد مرتب کیا ہے لباس سے لے کر موسیقی کے علم تک ، مجرے سے رقص کے فن تک اُس معاشرے کے رسوم، رواج مزہبی روایات، محرم کا جوش وخروش سب کچھ ناول کے صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے ۔ناول میں کرداروں کی زبان و بیان کے حوالے سے بھی تجربات کیے گئے ہیں۔لکھنؤ کی زبان پر ناول نگار کو بہت فخر ہے۔

وراثت کا نئی نسل تک منتقل نہ ہونا، کرداروں کی اموات، اچکن اور شیروانی کا باہمی فرق سب علامات ہیں جنھیں زوال کی نشانیوں کے طور پر لیا گیا ہے۔تیسرا ناول پری زاد اور پرندے نیئر مسعود کے افسانے چمن طاؤس رنگ کا سیکوئیل ہے۔نواب واجد شاہ کے طاؤس چمن سے کالے خان نامی ملازم ایک پہاڑی مینا چرالیتا

ہے اور پکڑا جاتا ہے اسے سزا ہو جاتی ہے اس کی بیٹی فلک آرا کی بیٹی فرش آرا سے کہانی شروع ہوتی ہے جو پنجرے بنا کر بیچتی ہے۔ چند کرداروں پر مبنی یہ ناول سادہ بیانیہ لیے ہوئے ہے فرش آرا یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کے نانا کالے میاں کے ساتھ کیا ہوا۔ اس ناول پری ناز اور پرندے میں انیس اشفاق 'طاؤس چمن کی مینا' کی فلک بوس بلندیوں کو تو نہیں چھو پائے البتہ اردو ادب میں فسانہ سے ناول لکھنا کے تسلسل کو لے کر نیا تجربہ کر گئے ہیں۔ تینوں ناولوں میں آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کے زمانے کے لکھنؤ کی گلیوں، بازاروں اور تہذیب و ثقافت کی جھلک ہے۔ قاری کو گمان ہوتا ہے کہ وہ مصنف ک انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ انیس اشفاق کے ناولوں مین جادوئی منظر نگاری، لکھنؤ کی بربادی، کتب خانوں، علم، امام باڑوں، مجلسوں، مسجدوں اور مندروں کا ذکر ہے۔

انیس اشفاق کے ناول لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہیں لیکن تہذیبیں تو بنتی اور مٹتی رہتی ہیں یہ ہی زندگی کا چلن ہے۔ ہر عروج کو زوال ہے۔ فرنگیوں کی ہندوستان پر حکومت اس لیے قائم ہو سکی تھی کہ ہندوستان می بنیادی انفراسٹرکچر نہیں تھا عوام کے لیے صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولتیں نہیں تھیں خود نواب تو سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے اور عوام شدید گرمی میں لائن میں کھڑے ہو کر نواب صاحب کی سواری کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ ہی تفریح ان کے لیے بہت معانی رکھتی تھی۔ عام انسان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے تھے جب کہ بادشاہ، راجا، مہاراجہ، نواب وغیرہ عیش وعشرت کی زندگی اختیار کیے ہوئے تھے ان کی حرم عورتوں سے آباد تھی اور طوائفوں بھی ان کی وظیفہ خوار تھیں۔ ان ناولوں کو جو کہ لکھنو کی تاریخ و تہذیب پر لکھے گئے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے مسلمان نوابوں، حاکموں اور بادشاہوں کو سوائے عیش پرستی کے کوئی کام نہیں تھا۔ اس لکھنو کے نوابوں نے تو عوام الناس کو بھی عیش پرستی کا اذن عام دے رکھا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے کوچہ و بازار جنس سے آراستہ ہو گئے ان کی محل سرائیں نگار خانے بنتی گئیں اور یوں لکھنؤ پر ایک جنسی ثقافت erotic culture کی چھاپ نظر آنے لگی۔ لکھنؤ کی تہذیب میں طوائف تہذیبی علامت بن گ ء۔

واجد علی شاہ رنگیلے پیا جان عالم خواتین کا لباس پہن کر رقص کرتا تھا اس کے پری خانہ میں تین سو خواتین تھیں۔ ایسے عیاش نواب کو فرنگیوں نے جب محل سے نکالا تو روتا ہوا نکلا۔ نواب واجد شاہ کو مٹیا برج کلکتہ جلاوط

کر دیا گیا۔حضرت محل نے بہادری کا ثبوت دیا اور انگریزوں سے ٹکر لی۔انگریزوں نے حضرت محل سے دشمنی کرتے ہوئے لکھنو میں عمارات کا انہدام کیا۔املاک کو نقصان پہنچایا۔ایک سو ستر سال پرانا لکھنو اپنی اصل حالت میں برقرار رہتا یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔وقت کے ہاتھوں تغیر لازم ہے۔بدلتی ہوئی زمانے کی روش کا ساتھ دینے والے ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔مسلمان ہمیشہ سے ماضی پرست رہے ہیں۔اسی وجہ سے ہندوؤں کے مقابلے میں انگریز مسلمانوں کو دشمن سمجھتے تھے۔ماضی کے راگ الاپنے سے تو قومیں ترقی نہیں کرتی۔کلچر اس قوم کا ہوتا ہے جو اقتدار میں ہو۔مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ہندو سرکار کو مسلمانوں کی تاریخی عمارات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔انگریزوں نے ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا بہت ظلم کیا لیکن انہوں نے مڈل کلاس بھی پیدا کی۔سرکاری نوکریوں کے ذریعے افراد کی مالی حالت بہتر ہوئی۔ریلوے کی سہولت دی ہسپتال سکول، کالج بنائے۔امراؤ جان ادا، خواب سراب ناول کی تہذیب طوائف کے گرد گھومتی ہے یہ طوائفیں مسلمان ہیں نواب بھی مسلمان ہیں یعنی مسلمانوں کی تہذیب عیش پرستی ہے؟ یہ ہی لیلا بھنسالی نے اپنی نیٹ فلیکس سیریز ''ہیرا منڈی'' میں دکھایا ہے۔

ایسی تہذیب کو ناول کی شکل میں پیش کر کے نئی نسل کو کیا پیغام دیا جا رہا ہے۔وہ نسل جو دین سے ویسے ہی دور ہے "نیٹ" جس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔سنیپ چیٹ، انسٹا گرام، فیس بک اور مائیکرو بلاگنگ کے سحر میں گم نئی نسل ماضی سے نظریں چراتی ہے۔حال سے بیزار ہے۔مستقبل سے ناامید ہے۔کسی شہر کی تاریخ کو ناول کی صورت میں محفوظ کرنا بہت اہم کام ہے قابل ستائش ہے۔لیکن ایسا معاشرہ جس میں اسلامی کی بنیادی اقدار کی کوئی اہمیت نہ ہو اس معاشرے کو اغیار غلام بنا لیتے ہیں پھر فرنگیوں کی معاشرتی اقدار بے پردگی، مخلوط محفلیں، گرل فرینڈ کلچر وغیرہ بھی معاشرے کے اقدار کا جزو بن جاتے ہیں۔لیکن جس معاشرے کو ہم ناول میں پڑھ رہے ہیں وہ تو پہلے ہی بہت ماڈرن ہے۔طوائفوں کے کوٹھے پر شرفا کے بچے شین قاف درست کرنے جاتے ہیں۔پھر یہ ہی بچے بلوغت کے بعد طوائفوں کے گاہک بن جاتے ہیں۔یہ کون سا اسلام ہے؟

انیس اشفاق کا چوتھا ناول ''پیچ'' ہے یہ ناول تقسیم ہندوستان کے بعد کے حالات پر مبنی ہے موجودہ عصری صورت حال بھی اس ناول میں دکھائی گئی ہے۔یہ ناول تقسیم ہندوستان کے بعد ہجرت کرنے والے مسلمانوں

اور ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے اس سے پہلے بھی کئی ادیب پروین طلحہ، قرت العین، عبداللہ حسین شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، احمد ندیم قاسمی ہجرت کے موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ہندوستان میں مسلمان اقلیت بن کر رہ گئے تھے اس اقلیت کو اکثریت نے ہر میدان میں دبانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی زمین پر اجنبی بن کر رہ گئے۔ لکھنو میں آج کوئی بورڈ اردو زبان میں نہیں ہے صرف انگریزی اور ہندی زبان میں آپ کو سائن بورڈ دکھائی دیتے ہیں۔

ناول سے اقتباس

''اردو وہ کوئی بھی حکومت ہو اس کے حلق سے نہیں اترتی۔ اس ادارے کو فقط ہماری آپ کی منہ بھرائی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اردو کو اس کا حق دینا ان کو گوارا نہیں۔''

زبان کے علاوہ بھی مسلمانوں کو ملازمتوں کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہیں۔ مسلم تہذیب وثقافت ہندوستان میں اجنبیت کا شکار ہے۔ مشرف ذوقی بھی اپنے ناولوں میں ان مسائل کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔

کہانی لکھنؤ کے پرانے محلے بنجاری ٹولہ کی کی ہے۔ جہاں تقسیم نے اپنوں کے بیچ ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ کوئی لکیر کے اُس پار جا رہا ہے تو کوئی لکیر عبور کرنے کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا۔ دراصل بن پروں والوں کے لی زمینیں زنجیریں ہی تو ہوتی ہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ہجرت نے مسلمانوں کو مزید غم ناک کر دیا خاندان کے آدھے افراد ہجرت کر گئے آدھے ہندوستان میں رہ گئے۔ جو چلے گئے وہ تو گئے س گئے جو رہ گئے ان کے لیے ان کا اپنا محلّہ اپنا علاقہ اجنبی بن گیا۔ ناول میں ہندوستان کے اور پاکستان کے سیاسی حالات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بیشمار قربانیوں کے بعد پاکستان کا وجود عمل میں لایا گیا تھا۔ جو ملک مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کو ہجرت کر کے اسے آباد کرنا چاہیے تھا۔ لاکھوں مسلمانوں نے ہجرت کی تو ہندوستان کے اقلیت کہلانے وال مسلمان بھی ہجرت کر لیتے۔ قیام پاکستان کے کئی برس بعد تک بھی مسلمان ہجرت کرتے رہے ہیں۔ مسائل ہر معاشرے میں ہوتے ہیں وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے یہ ہی زندگی کی حقیقت ہے۔

ٹرانسجینڈر ایکٹ اور پاکستانی معاشرہ

میرے وطن پاکستان کو اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شروع سے سامنا رہا ہے۔مخدوش سیاسی صورت حال، کمزور معیشت، غربت، جہالت، بے روزگاری، قدرتی آفات اور دیگر کئی مسائل سے نبرد آزما یہ ملک بنایا ت اسلام کے نام پر گیا تھا لیکن اس میں آج تک اسلامی نظام قائم نہ ہوسکا''خواجہ سرا افراد تحفظ حقوق'' نام کا قانون جواب قومی اسمبلی اور سینٹ سے پاس ہو چکا ہے اس وقت زیر بحث ہے۔

ٹرانس جینڈر سے مراد خواجہ سرا لیا جاتا ہے مرد اور عورت کے علاوہ تیسری جنس۔اس تیسری جنس کے افراد کروموسومز کے غیر معیاری ملاپ کی وجہ سے مرد اور عورت دونوں کی خصوصیات لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ترقی کے مواقع انہیں نہیں ملتے اور یہ ناچ گانے اور عیاش افراد کے جنسی تجربات کے لیے مخصوص کر دیے جاتے ہیں۔

LGBT سے مراد ہے transgenderbisexual,gay,lesbian,

جس ٹرانس جینڈر قانون کی اس وقت ہر طرف دھوم ہے آیئے دیکھتے ہیں یہ کیا ہے؟

ٹرانس جینڈر پرسنز (پروٹیکشن آف رائٹس) ایکٹ 2018 (یا خواجہ سرا افراد تحفظ حقوق ایکٹ 2018) کے نفاذ کے بعد پاکستان کا شمار دنیا کے ان مٹھی بھر ممالک میں ہو گیا جہاں تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے شہریوں کے تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، کام کی جگھوں، دوسرے عوامی مقامات اور وراثت کے حصول میں حقوق ک قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

مذکورہ قانون پاکستان میں پہلی مرتبہ ٹرانس جینڈر افراد کو قانونی شناخت فراہم کرنے کے علاوہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک اور ہراساں کیے جانے کے خلاف تحفظ کے لیے اقدامات وضع کرتا ہے اور مقامی حکومتوں

پر اس کمیونٹی کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے۔ٹرانس جینڈر پرسنز (پروٹیکشن آف رائٹس) ایکٹ تیسری جنس سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی جنس کا انتخاب اور اس شناخت کو سرکاری دستاویزات بشمول قومی شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس میں تسلیم کرنے کی اجازت دینے کے علاوہ ٹرانس جینڈرز کے سکولوں، کام کی جگہ، نقل و حمل کے عوامی طریقوں اور طبی دیکھ بھال حاصل کرنے کے دوران امتیازی سلوک سے منع کرتا ہے۔قانون کہتا ہے کہ ٹرانس جینڈر افراد کو ووٹ دینے یا کسی عہدے کے لیے انتخاب لڑنے کا حق سے دینے، اور ان کی منتخب جنس کے مطابق وراثت میں ان کے حقوق ک تعین کرنے اور حکومت کو جیلوں یا حوالاتوں میں ٹرانس جینڈر افراد کے لیے مخصوص جگہیں اور پروٹیکشن سینٹرز اور سیف ہاؤسز قائم کرنے کا پابند بناتا ہے۔قانون میں ٹرانس جینڈر اشخاص کی تعریف کرتے ہوئے انہیں تین اقسام انٹرسیکس، خنثہ اور ٹرانس جینڈر (مرد یا عورت) میں تقسیم کیا گیا ہے۔بظاہر تو یہ قانون خواجہ سرا کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ ہم جنس پرستی کو قانونی جواز فراہم کرنے کی ایک سازش ہے۔ ہر معاشرے میں ہم جنس پرستوں کی ایک تعداد ہوتی ہے جو خفیہ طور پر غیر فطری حرکات میں مصروف عمل رہتی ہے۔ دراصل یہ ابنارمل افراد ہوتے ہیں جن کی ذہنی الجھنیں، بچپن کے ناخوشگوار تجربات، جنسی استحصال ان لوگوں کو ہم جنس پرست بنا دیتا ہے۔ GAY بن کر یہ خفیہ طور پر یہ اپنی جنسی بھوک مٹاتے ہیں اگر ان کے خاندان یا معاشرے کو ان کی سرگرمیوں کا علم ہوجا؟ تو انہیں شدید ذلت اور سماجی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لزبین خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں پاکستان میں کافی کم ہے۔اس بل پر عملدرآمد کی وجہ س ناجائز جنسی تعلقات بڑھ جائیں گے اور جنسی زیادتی کے واقعات میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔

پاکستان میں اس قانون کے نفاذ کے بعد کوئی بھی پاکستانی شہری کسی بھی وقت اپنی جنس کی تبدیلی کے لیے نادرا آفس سے رجوع کرسکتا ہے۔عورت مرد اور مرد خود کو عورت نامزد کرسکتا ہے پھر مرد جو کہ درحقیقت مرد ہے خود کو عورت قرار دے کے کسی مرد سے شادی کرسکتا ہے ایسے دو مرد شادی کر کے اکھٹے رہ سکتے ہیں۔اس قانون کے نفاذ کے بعد جنسی تبدیلی کی انتیس ہزار سے زیاد درخواستیں نادراہ کو موصول ہوچکی ہیں۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ علما نے اس بل کو پاس ہونے کی اجازت دی۔ واحد سیاسی جماعت جماعت

اسلامی نے اعتراضات اٹھائے اور باقی سب خاموش رہے۔ہم مسلمان ہیں ہماری کتاب قرآن جو ہمیں قوم لوط کا قصہ سناتی ہے۔لواطت جیسے قبیح فعل نے اس قوم کو برباد کر دیا تھا۔پتھروں کی بارش عذاب کی صورت ان لوگوں کو ختم کر گئی کیونکہ وہ لوگ اپنی محفلوں میں کھلے عام اس بے حیائی کے کام کو کیا کرتے تھے اور پھر اس پر فخر کرتے تھے۔کیا ہمیں بھی پتھروں کی بارش کا انتظار ہے۔سیلاب نے آدھے سے زیادہ پاکستان کو ڈبو رکھا ہے ۔اس عذاب سے نمٹنے کے لیے وسائل کی کمی ہے۔اور ہم ایسے قوانین بنا رہے ہیں۔کسی برائی کو علی الاعلان کرنا اور اسے قانونی تحفظ دینا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے پاکستانی معیشت سودی کاروباری نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرضوں کا بھاری بوجھ اور کمزور معیشت دونوں ہی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اللہ سے یہ جنگ تو ہم نے خود شروع کر رکھی ہے ۔کرپشن کا یہ عالم ہے کہ بحیثیت قوم ایمانداری ناپید ہے ۔ان مسائل میں LGBT کیا گل کھلائے گا۔

ہم جنس پرستی کے لیے راہ ہموار کرنا مغربی ایجنڈے کا حصہ ہے جس کو پھیلانے کے لیے سینما اور ادب دونوں کو استعمال کیا جا رہا ہے ہندوستان میں علی گڑھ نامی فلم بنائی گئی ہے۔جو کہ ایک ہم جنس پرست پروفیسر ڈاکٹر شری واس رام چندرا شراس کی زندگی پر مبنی ہے۔اس موضوع پر بننے والی نئی فلم"بدھائی دو" ہندوستان سے ریلیز ہوئی ہے یہ فلم ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی کو بیان کرتی ہے جس میں مرد gay ہے اور اس کی بیوی لزبین ہے میاں اپنے عاشق اور بیوی اپنی محبوبہ سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔آپس میں ان کے جسمانی تعلقات نہیں ہوتے ہیں اس لیے اولاد بھی نہیں ہوتی خاندانی پریشر کی وجہ سے وہ ایک بچہ گود لے لیتے ہیں اس فلم میں ہم جنس پرستوں کو مظلوم بنا کر پیش کیا گیا ہے ان کے غیر فطری میلان کو ان کی مجبوری بتایا گیا ہے ۔شروع میں ان کے خاندان کے افراد ان کی حرکات پر شدید ردعمل دیتے ہیں پھر انہیں قبول کر لیتے ہیں۔

فلموں کے علاوہ ناولوں اور افسانوں کی شکل میں بھی ہم جنس پرستی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ہندوستان کے ادبی جریدے"اثبات"نے"ہم جنس پرست نمبر" شائع کیا ہے جس میں عصمت چغتائی کا مشہور افسانہ لحاف، مشرف عالم ذوقی کا"دو کائنات بہنیں" وغیرہ اور دیگر اس نوعیت کے مواد شامل کیے گئے ہیں۔"افتخار نسیم افتی "مشہور بدنام زمانہ gay شاعر کی نظمیں وغیرہ شامل کی گئی ہیں۔

علی اکبر ناطق کا ناول ''کماری والا'' میں ہم جنس پرستی کے چند واقعات بیان کیے گئے جب کہ اشعر نجمی کا ناول ''اس نے کہا تھا'' لواطت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ناول ''اس نے کہا تھا'' میں تو اشعر نجمی نے معاشرے کے سماجی ڈھانچے پر وار کیا ہے۔ہم جنس پرستوں کو مجبور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔مرد ہم جنس پرستی اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں خواتین میں دل چسپی نہیں ہے۔اور دو خواتین بھی ماں اور ممی بن کر ساتھ رہ کر ایک بچہ پال لیتی ہیں ان میں سے ایک بچے کی اصلی ماں ہے یہ بچہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہے اور یہ دونوں خواتین لزبین ہیں یہ خود کو بچے کے والدین سمجھتی ہیں۔بچہ جو کہ ہم جنس پرست بن جاتا ہے۔مختلف تجربات کو جوڑ کے ناول کی بنت کی گئی ہے۔اس ناول کو انتہائی گھٹیا،سستی جذبات نگاری اور فحش نگاری کی اعلی مثال قرار دیاج سکتا ہے۔

اس ناول کے کردار معاشرے کے ناکارہ ترین مرد ہیں جو کہ سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں کر پاتے بلوغت تک پہنچتے ہی یہ افراد اس مکروہ عادت کا شکار بن جاتے ہیں اور پھر ساری عمر ہم جنس پرستی کی لعنت کا شکار رہتے ہیں۔اس ناول کو پاکستان میں بھی شائع کیا گیا ہے۔غیر مسلموں کو تو ایسے نظریات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن بحیثیت مسلمان ہمارا معاشرہ جو کہ پہلے ہی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے یہ نیا قانونی وار سہہ نہ پا؟ گا۔ٹرانس جینڈرز کے حقوق سے متعلق قانون جلد بازی کا نتیجہ ہے،اور اس میں بہت زیادہ کجی موجود ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ٹرانس جینڈر کی شناخت کے لیے میڈیکل بورڈ لازمی ہونا چاہیے۔اس بورڈ کے معائنے کے بعد جنس کا اندازہ لگانا چاہیے اور نادارا کو بھی اس بورڈ کے دیے ہوئے نتیجے کا پابند ہونا چاہیے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس ملک میں عام شہریوں کو حقوق نہیں مل رہے وہاں بل پاس کرنے سے خواجہ سرا کی سماجی حیثیت بہتر ہو پائے گی۔اگر خواجہ سرا کو معاشرے کا فعال شہری بنانا ہے تو ان کے لیے اسکول،کالج اور یونی ورسٹیز قائم کی جائیں۔انہیں ملازمت دی جائے۔ان کی دینی تربیت کی جائے۔اس بل سے خواجہ سرا کو تو حقوق ملتے نظر نہیں آتے البتہ غیر فطری تعلقات والوں کو چھوٹ مل جائے گی۔اس طرح کے بل پاس کر کے عذاب الہی کو دعوت دے کر ہم شخصی آزادی کی ترقی میں کتنا حصہ ڈال سکیں گے سوچنا یہ ہے۔

مسوجنسٹ مت بنئیے !

مرد اور خواتین سے مل کر معاشرہ بنتا ہے یعنی کہ دونوں انسان ہیں۔ دونوں میں فیمینسٹ اور مسوجنسٹ کی تقسیم ہی بے بنیاد ہے۔ میں عورت ہوں یہ ہی مری شناخت ہے۔ فیمینزم کی تحریک کا مقصد بھی یہ ہی تھا کہ میں عورت ہوں لہذا مجھے حقوق دیے جائیں۔ فیمینزم کی تحریک بھی عورت کو حقوق دلوانے کے لیے چلائی گئی تھی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب مرد ردی، ریپسٹ اور مسوجنسٹ ہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے بلکہ تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ خواتین کو ان کے جاۓ حقوق دیے جائیں۔ انہیں تعلیم کا حق دیا جا؟ اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع بھی فراہم کیے جائیں۔ یہ ہی فیمینزم ہے کہ معاشرے میں مساوات کو فروغ دیا جا؟۔ ہر جنس دوسری جنس کے برابر ہے، مرد، عورت، خواجہ سرا سب کو برابر حقوق ملنے چاہیے۔ اور ترقی کے یکساں مواقع بھی۔

اسی اور نوے کی دہائی سے پوسٹ ماڈرنسٹ فیمینزم، پوسٹ کالونیل فیمنزم اور ایکوفیمینزم کے رجحانات تیزی سے فروغ پاتے جا رہے ہیں۔ آٹھ مارچ کو خواتین کا عالمی دن قرار دیا گیا تو اس دن عورت مارچ بھی سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ عورتوں کو مارچ کا حق ہے لیکن عورت کی اہمیت کو صنفی پیمانہ سے ماپنا بالکل غلط ہے اس طرح سے تیسری دنیا کے ملکوں کیلئے فیمینزم خصوصی طو خطرناک رجحان بن کر سامنے آتا ہے۔

استعماری بیانیوں کیوجہ سے عوام میں بھی ردعمل پیدا ہوتا ہے جو عورتوں کی آزادی کے بلند مقاصد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تیسری دنیا کے مما لک مابعد نوآبادیات کی پھیلائی ہوئی سامراجی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ عورت آج بھی پسماندہ ترین مخلوق ہے اس کی قربانیوں کی قدر کرنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ محرومی کا یہ احساس بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ مذہبی ضابطوں کی پابندی بھی نئی نسل کو گراں گزرتی ہے۔ پھر سارا

الزام فیمینزم پر آ جاتا ہے کہ یہ عورتوں کو مرد دشمنی پر لگا رہا ہے۔ ہمارا دین اسلام عورتوں کو بے شمار حقوق دیتا ہے لیکن معاشرہ عورت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ ہی وہ اندرونی بھڑاس ہے جسے نکالنے کے لیے فیمینسٹ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی پیشے سے ڈاکٹر تھیں اور مزاج سں شاعرہ اور افسانہ نگار۔ان کا تعلق ایک امیر ذمیندار گھرانے سے تھا۔وہ مجرد رہی انہوں نے دو شاعری کی کتابیں اور ایک افسانے کا مجموعہ تخلیق کیا۔"مرے پر نہ باندھو" نے بہت شہرت پائی ۔اسی اور نوے کی دہاء میں وہ بہت اہم تخلیق کار کے طور پر ادبی افق پر فعال تھیں۔نشتر ہسپتال ملتان میں ڈاکٹر تھیں۔وہ بہت ذہین اور حساس تھیں اور شعر و ادب کی دنیا (ہم مانیں یا نہ مانیں) حسد سے لتھڑی ہوء، بہت بے رحمانہ منفی آرا سے حساس ترین تخلیق کاروں کو ذہنی اذیت دے دے کر جینا دوبھر کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی ایک بڑے زمیندار روایت پسند گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ان وجوہات کو تو علم نہیں کہ انہوں نے شادی کیوں نہ کی۔محبت میں ناکامی یا خاندان سے باہر شادی نہ کرنے کی روایت جانے کیا وجہ تھی کہ وہ تنہا زندگی گذارتے گذارتے سارے بھرے میلے سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئیں۔۔ادبی محافل،شاید لکھنا بھی،سب کچھ چھوڑ دیا۔شاید لوگوں کی بے حسی نے انہیں مایوسی اور ناامیدی کے ایسے موڑ پر پہنچا دیا کہ وہ جینے کا حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھیں اور کچھ عرصہ پہلے انہیں دیکھا تو ایسا لگا تھا کہ وہ زندہ ہوتے ہو؟ بھی زندگی سے دستبردار ہو چکی تھیں۔ایک تخلیق کار چاہتا بھی کیا ہے،صرف داد و تحسین کے چند جملے،مگر ہم احساس کمتری کے مارے کسی کو سراہنے کی توفیق نہیں رکھتے۔صرف الزام تراشی کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر غزالہ خاکوانی ہمت ہار چکی تھی۔انہوں نے آخری بیس برسوں میں ادب،تخلیق اور زندگی سے کنارہ کشی کر لی تھی۔وہ ۵ اپریل ۲۲۰۲ کو چار رمضان المبارک ک وفات پا گئی۔

ہوش بلگرامی کی متنازعہ کتاب ’’مشاہدات‘‘

ہوش بلگرامی کی متنازعہ کتاب ’’مشاہداتت‘‘ دروغ گوئی کا مرقع ہے۔خودنوشت لکھنے کافن اردوادب میں نیانہیں ہے۔بیشارلوگوں کی لکھی ہوئی سوانح عمری سےمخلوق خدانے فائدہ اٹھایا۔یہ سوانح عمری معلومات کا بہترین ذریعہ ہیں۔ہوش بلگرامی صاحب شاعر تھے۔نثر نگار تھے۔ان کی سوانح عمری’’مشاہدات‘‘ کے نام سے منظر عام پرآئی اوراس کے متنازعہ مواد کیوجہ سے اس پر پابندی لگادی گئی۔اس کتاب میں من گھڑت قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔فاضل مصنف نے خودکواخلاق یافتہ ترین قرار دے کراکثرصفحات پراخلاقی لیکچر دیے ہیں۔اوراہم ترین شخصیات کو ہدفِ تنقید بنایاہے۔جن شخصیات نے ہوش صاحب کوملازمت دی،عزت دی،رتبہ دیاانہوں نے انہی کی فرضی عیاشیوں اور بشری خامیوں کاذکرکیاہے۔افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ انہوں نے خوبیوں کوبھی خامیاں قراردیا۔نواب حامدعلی خان رامپور کے پاس ہوش بلگرامی دس برس رہےلیکن جس تھالی میں کھایااسی میں چھید کیا۔نواب صاحب کی عادات وخصائل اوران کی نجی زندگی پراپنی بھونڈی رائے انتہائی منہ پھٹ انداز میں دی۔صاف گوئی اس کونہیں کہتے۔سنی سنائی باتوں کوکتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

نواب حامدعلی خان روشن شخصیت تھےان کے زریں عہدکےاثرات آج بھی رامپور میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کی حامدمنزل آج رضالائبریری ہے جہاں دنیا بھرسے اسکالرز ریسرچ کے لیےآتے ہیں۔ان کے قائم کیےاسکول آج بھی چل رہے ہیں۔ایسی علم دوست فن ک قدردان شخصیات صدیوں میں پیداہوتی ہیں۔

دوسری شخصیت جن سے ہوش نےفیض اٹھایاوہ میرعثمان علی خان نظام حیدرآباد ہیں۔اس اہم شخصیت کو جواس وقت دنیا کی امیرترین بااثرشخصیت تھی جس کےفیض سے رعایا خوش حال تھی اس انسان کوبخیل،غلیظ،کم عقل،آدم بیزاراورنااہل بناکرپیش کیا گیا پھران کوبھی جوانی میں شرابی اورعیاش سمجھا گیا۔ان کی جوانی میں تو

فاضل لکھاری صاحب موجود تھے ہی نہیں ۔تو ہوش صاحب نے میر عثمان علی کو کیسے عیاش قرار دے دیا۔میر عثمان نمازی اور عبادت گزار تھے ۔آپ سادگی پسند تھے اتباع رسول میں سادہ لباس پہنتے ۔سادہ خوراک کھاتے ۔سادہ طرز زندگی اپناتے ۔فضول خرچی نہ کرتے ۔ان خوبیوں کا ہوش نے مذاق اڑایا ہے۔پھراس پر بھی بس نہیں۔ ہوش نے اپنی سگی بیٹی کا ذکر بھی انتہائی نامناسب الفاظ میں کیا ہے کاش کہ یہ کتاب شائع کروانے سے پہلے ہوش کسی کو دکھا لیتے ۔یوں لگتا ہے مشاہدات کے نام پر تعفن بھری یہ کتاب ہوش نے ہوش میں نہیں لکھی ۔انسانوں کا ذکر مثبت انداز میں کیا جاتا ہے نہ کہ منفی انداز میں ۔اور محسن کا ذکر کرتے ہوئے تو ادب کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنے چاہیے ۔پھرایسی کتاب کو اگر پابندی کا سامنا کرنا پڑا تو حیرت کیسی ۔اس کتاب پر ہنوز پابندی لگنی چاہیے۔

زمانہ چال قیامت کی چل رہا ہے

پاکستان جیسے ترقی پذیر معاشی بدحالی کے شکار، غیر یقین سیاسی صورت حال سے دوچار ملک میں امریکا کی دل چسپی کے بے شمار مواقع ہیں۔ دہشت گردی کے خاتمے کی جنگ میں لاکھوں بے گناہ شہری اور فوجی مروا کر بھا امریکہ خوش نہ ہوسکا۔ افغانستان سے امریکی فوج کے انخلاء کے بعد اب امریکہ نے پاکستان کے سماجی ڈھانچے پر وار کیا ہے۔ نیٹ کے ذریعے ثقافتی یلغار تو دو دہائی سے جاری ہے۔ جس کے نتائج بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

چندروز قبل JaneRaining نامی بینڈ کو امریکہ پاکستان بھیجتا ہے جس میں Bloomfield,Mai Tavakoli.MonaandPotter,ChaskaGebhardt,Becky نامی چار افراد شامل ہیں جو کہ اس بینڈ کی ممبرز ہیں۔

پاکستانی حکومت امریکی کونسل جنرل کے ساتھ مل کر اس بینڈ کو خوش آمدید کہتی ہے۔ یہ بینڈ چار خواتین پر مشتمل ہے جو کہ ہم جنس پرست ہیں ان میں سے دو خواتین نے باقاعدہ آپس میں شادی کر رکھی ہے۔ اس بینڈ کے کانسرٹ پنجاب کی بڑی یونی ورسٹیز میں منعقد کیے جاتے ہیں جہاں خواتین اسٹاف اور فی میل طلبہ کی شرکت لازم قرار دی جاتی ہے۔ کراچی آرٹس کونسل جیسے نمایاں ادارے میں بھی ان کی پرفارمنس رکھی جاتی ہے جو احتجاج کے بعد ملتوی کر دی جاتی ہے۔ آج امریکہ کی یونی ورسٹیز میں غزہ میں جاری یہودی جارحیت کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے اور پاکستان جیسے اسلامی ملک میں نوجوانوں کے لیے حکومت ہم جنس پرستی جیسے قبیح فعل کو سماجی قبولیت دینے کے لیے کوشاں ہے۔ فلسطین کے مسلمانوں سے یکجہتی کے لیے تو اس ملک سے کوئی صدا بلند نہیں ہو رہی نہ عوامی سطح پر نہ ملکی سطح پر۔ دینی طبقہ دعا کے سہارے پر ہے۔ کیا جنگ دعا سہارے لڑی

جاتی ہے کیا جہاد دعا سے کیا جاتا ہے تلوار کی جگہ ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں ۔ بے غیرت حکمران بے حس عوام یہ ہے پاکستان ۔ پاکستان میں ہم جنس پرستی کی راہ ہموار کر کے نوجوان نسل کو شہوت پرستی میں مبتلا کر کے مری ہوئی مسلمان قوم کا ضمیر حالت بے ہوشی میں رکھنے کا یہ منصوبہ ان دجالیوں کے ذہن کی اختراع ہے جو کہ دجال کے لیے مسجد اقصیٰ شہید کر کے ٹیمپل بنانا چاہتے ہیں ۔آل سعود کے آشیر باد کے ساتھ اسرائیل فلسطین میں خون کی ہولی کھیل رہا ہے

کسی سامری کی بشارتیں، یہ حرم سے اونچی عمارتیں
وہ مزے جو پہلے حرام تھے، وہ ملیں گے آلِ سعود سے !

سعودی عرب نے ترکی سے اقتدار لینے کی خاطر خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا تاریخ کا سیاہ باب ہے ۔ملکہ وکٹوریہ کی وظیفہ خوار آلِ سعود امریکہ کے اشاروں پر کئی دہائیوں ناچ رہی ہے ۔جب کہ ہمارا ملک پاکستان کلمے کے نام پر بنایا گیا تھا بے شمار قربانیوں کے بعد ہجرت کے درد سے جان بلب یہ ملک اس لیے تو نہیں بنا تھا کہ کسی اسلامی ملک پر اسلام دشمن حملہ آور ہوں اور پاکستانی قوم کرکٹ میچز اور ہم جنس پرستوں کے کانسرٹ پر جھوم رہی ہو ۔اس طرح کے بینڈ زامریکہ سے نوممالک کو بھیجے گئے ہیں ۔

اوران سب کا مقصد ہم جنس پرستی کے لیے راہ ہموار کرنا ہے ۔ پاکستان میں LGPTQ کا قانون پاس کروانا اسی سازش کا ابتدائیہ ہے ۔اس قانون کی آڑ میں ہم جنس پرستوں کو جو تحفظ فراہم کیا گیا اس پر بھی ہم نے صدائے احتجاج بلند کی تھی ۔ پاکستان کی یونی ورسٹیز کے نت نئے اسکینڈلز آئے روز سامنے آتے رہتے ہیں ۔نوجوان بچیوں کی دینی تعلیم کا خانہ تو ویسے ہی خالی ہے ۔ایسے حالات میں زیادہ دیر تک ان رجحانات کو روکنا ممکن نہیں ہوگا ۔حکومتی سطح پر ان عوامل کی روک تھام بے حد ضروری ہے ۔اگر معاشرے کو اس قسم کی آزادی کا اذنِ عام دے دیا گیا تو نکاح جیسے فریضے کو پس پشت ڈال دیا جائے گا خاندانی نظام کا ڈھانچہ بکھر کر رہ جائے گا ۔معاشرہ بتدریج تباہ ہوتا چلا جائے گا ۔ایک طرف (آئی ایم ایف) اپنی شرائط کے ذریعے عام پاکستانی کو مہنگائی کے شکنجے میں کس رہی ہے دوسری طرف اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں ۔

ہمارے ملک پاکستان میں معاشرتی ناانصافی پر اگر کوئی احتجاج کرتا ہے تو اسے اٹھالیا جاتا ہے ہمارے ہم

عصر (احمد فرہاد) نامی شاعر کو ان کی رہائش گاہ اسلام آباد سے غائب کر دیا گیا۔ ادبی تنظیموں ،صحافیوں اور شاعروں کے احتجاج کے باوجود ابھی تک کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اب معاشرے کا چلن نہیں رہا۔ایک شاعر سے کسی کو کیا خطرہ ہے سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمارے سماج میں کن افراد کو آج آئیڈیل بنا کر پیش کیا جا رہا ہے کرکٹ کے ان پڑھ ہیروز کو۔ غیر مذہب کے ہم جنس پرست گویے کو۔کیا امت مسلمہ کے آئیڈیل ایسے ہوتے ہیں امت میں آج کوئی چنگاری باقی نظر نہیں آتی ۔اسرائیل کی جارحیت کے خلاف کسی اسلام ملک سے مزاحمت کی آواز نہی اٹھائی جاتی ۔ایسے حالات میں اہل علم وقلم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

سیمیں خان درانی کی مبینہ خودکشی

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ اس کی منافقت ہے۔ مغربی معاشرے میں منافقت نہیں ہے اس لیے ان کے مسائل ہمارے مسائل جیسے نہیں ہیں۔ کہنے کو تو پاکستان اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے لیکن یہاں اسلامی نظام کی جگہ انگریز کا بنایا ہوا عدالتی نظام رائج ہے۔ اور جمہوریت کی جگہ سول مارشل لاء نے لے رکھی ہے۔ اس معاشرے میں کسی عورت کا عورت ہونا ایک بڑا جرم ہے۔ اور اگر عورت لکھاری ہے تو پھر تو اس پر بغاوت کی دفعات بھی لگتی ہیں۔ عورت غریب ہے تو وہ مرد کے ساتھ معاشی جدوجہد میں شامل ہے اور کی اس جدوجہد کا صلہ اسے شوہر کی گالی گلوچ اور مار پیٹ کی شکل میں ملتا ہے۔ عورت اگر پڑھی لکھی ہے تو کبھی کبھی اس کا باشعور ہونا ہی اس کا جرم بن جاتا ہے۔ سیمیں خان درانی کا بھی یہ ہی جرم تھا کہ وہ شاعرہ تھی افسانہ نگار تھی۔ وہ خوب صورت تھی، خوش ادا تھی اا سلام آباد کے ادبی حلقے کی جان تھی۔ اچھے خاندان سے تھی مگر بدقسمت تھی۔ اس کے خوبصورت وجود کے اندر چھپا غم، اس کے قہقہوں میں چھپا درد کسی کو دکھائی نہ دیا۔ والدین کی اطاعت ہی اس کا جرم بن گئی۔ والدین نے اس کی شادی سندھ کے ایک وڈیرے سے کردی۔ سسرال اور شوہر دونوں کے ساتھ نبھاتے نبھاتے سیمیں دو بیٹوں کی ماں بن گئی۔ بیٹے کی ماں ہمارے معاشرے میں بہت خوش قسمت تصور کی جاتی ہے لیکن سیمیں تو بدقسمت تھی۔ پڑھے لکھے جاہل شوہر کے مظالم سہنا اس کے لیے کرب ناک تھا بچوں کی خاطر نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے سود رہی اور سیمیں خان درانی کو طلاق ہوگئی۔ بیٹے چھین لیے گئے ان کی شکلیں دیکھنے کو ترس گئی۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد بچے سیمیں کو مل گئے۔ سیمیں کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ دو ماہ قبل اس کی ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن ہوا تھا اور وہ کافی بہتر تھی کہ اس کی وفات کی خبر آ گئی۔ سیمیں کی چند دن پرانی لاش پنکھے سے لٹکی ہوئی پولیس کو ملی۔ پولیس نے خودکشی کا ٹھپہ لگایا اور لاش ورثا کے حوالے کردی۔ اور 7 جولائی 2022 کو سیمیں کی بہاولپور میں تدفین کردی گئی۔ سیمیں خان درانی خواتین فورم کے صدر

کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں خواتین کی فکری ترقی کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ 4 فروری 1971 کو راولپنڈی میں پیدا ہوئی تھیں۔ سیمیں نے پبل ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری مکمل کی اور سٹی بینک سے مینیجر سٹی گولڈ کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ملازمت کے دوران سیمیں نے بزنس ڈویلپمنٹ، کارپوریٹ قانون، ہیومن ریسورس منیجمنٹ، پروجیکٹ مینجمنٹ اور مارکیٹنگ میں وسیع تجربہ حاصل کیا۔

سیمین درانی نے NUML کے پہلے بیچ میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم دی۔ وہ درس و تدریس سے وابستہ رہی۔ سیمین درانی نے اپنی زندگی کے دوران متعدد عنوانات حاصل کیے جن میں صدر پاکستان پیٹرولیم نیٹ ورک، ایسوسی ایشن کے صدر، طلباء پبلک ایڈمنسٹریشن، ہوسٹن میں مقیم نیوز لیٹر کے شیف ایڈیٹر اور معروف ماہانہ میگزین سنگت کے ایڈیٹر شامل ہیں۔ سیمیں بچپن سے ہی ادب میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ 2020 میں سیمیں کے افسانوں کا مجموعہ ''آنول نال'' چھپا۔ جن میں پیڈوفیلیا، سائنس فکشن، تقابلی مذہبی عقائد اور تانیثی تصورات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ طویل ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے بعد علیحدگی، بچوں کے قانونی حصول کے لیے جنگ، ہارٹ اٹیک، بیک بون ٹیومر اور ڈپریشن نے سیمیں کو کمزور کر دیا تھا۔ سیمیں کو قتل کیا گیا یا اس نے خود کشی کی۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد وہ زندگی کے بدصورت چہرے سے نجات پا گئی۔ اب اسے کسی کی گالیاں نہیں سنائی دیں گی۔ کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھائے گا اسے ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں ملے گی۔ سیمیں نے زندگی میں بہت درد سہے اللہ تعالی اس کا وہ جہان اچھا کرے وہاں اسے سکون نصیب ہو۔ آمین

سیمیں درانی کی آخری نظم الوداع پڑھیے۔

میری تعلیم
میرے ماں باپ کی تربیت
اور میرے خاندان کی ناموس
وقتِ بندھن

میرے تمام تر پر
کاٹ دیتی ہے
وہی پر
کہ
جنکو سنوارتے بڑھاتے
میرا بوڑھا باپ
عمر خمیدہ ہوا
اور
میری ماں
ان میں رنگ بھرتے بھرتے
اپنے ہی سب رنگ
کھو بیٹھی
پھر
وہ دن آن پہنچا
کہ جب
انگنت انجان چہرے
ایک ایسا نر لائے
جس کو
ایک پر کٹی مادہ کی تلاش تھی

پھر

میں نے آہستہ آہستہ

اپنے تمام پر

دین و دنیا کی بُنی روایات سے

کترنے شروع کر دیئے

کچھ سے حنا گھولی

کچھ سے منہ پہ لالی لگائی

اور پھر آخری پر سے

اس معائدے پہ دستخط کئے

جو مجھے اس شخص کی جاگیر بناتا تھا

وقت رخصتی

میری ماں نے اپنا دوپٹہ

اور باپ کی پگڑ کو

رشتوں کے دھاگے سے سی کے

میری آنکھوں پہ باندھا

اور کہا

الوداع

کماری والا ناول میں ثقافتی سماجی اور ساختی عناصر

علی اکبر ناطق شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ان کا پہلا ناول نولکھی کوٹھی بے حد مقبول ہوا۔ ہر معاشرے کی تہذیب اور ثقافت اس کے ادب سے چھلکتی ہے۔ یہ ہی کلامیہ بعض اوقات قاری پر متاثر کن اثرات چھوڑتا ہے۔ادب کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر اس ناول کماری والا میں علی اکبر ناطق نے سادہ کلامیہ کے ذریعے بیان کیا ہے۔اسی کی دہائی کے واقعات جو کہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، مذہبی اور فرقہ روانہ لسانیت کے رنگ لیے ہوئے ہیں ناول میں سمو دیے گئے ہیں۔

جب بھی کسی معاشرے میں کوئی فن پارہ تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو وہ کرداروں کی زبانی ثقافتی پہلوؤں کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ معاشرتی عوامل اس عمل میں معاونت کرتے ہیں۔لکھاری کی زبان ساختی تبدیلیوں کے تحت کسی مخصوص خطے کی ثقافت بیان کرتی ہے جسے اس ناول کے پلاٹ میں برتا گیا ہے۔معیاری کلامیہ ثقافت کا فنی ساختہ ہے۔تخلیق کار مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہو؟ لسانی، ساختی، موضوعاتی اور ثقافتی جہات کو نئی جہتیں دیتا ہے۔ساختیاتی تبدیلیاں متن کی تہہ میں مسلسل ہوتی رہتی ہیں۔علی اکبر نے ناول کے پلاٹ کو اس طرح سے مربوط کیا ہے کہ قاری مسلسل پڑھتا چلا جاتا ہے قاری کا ہاتھ پکڑ کر علی اکبر جس پگڈنڈی پر اسے چلاتے ہیں وہ رکے بغیر چلتا جاتا ہے۔

اس ناول کماری والا میں علی اکبر نے ایسے درختوں کے نام بیان کیے ہیں جو اس مقامی زبان میں رائج ہیں جب کہ غیر مقامی افراد کے لیے وہ نئے ہیں۔ دیہاتی منظر نامے کی پیشکش منشی پریم چند سے شروع ہوئی اور اسے کئی ادیبوں نے اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ جدت کے اس دور میں علی اکبر ناطق کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے ان کے اس ناول کو مقبولیت ملی اور حال ہی میں اس ک تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔آج سے چالیس سال پہلے کے واقعات کو اس طرح اس ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ تجسس کی فضا برقرار رہتی ہے۔ضامن علی کو اپنی محبوبہ کئی

سال بعد ملتی ہے تو اسے پہچان نہیں پاتا اور حیران رہ جاتا ہے۔ناول کی ابتدا ایک مسافر سے ہوتی ہے جو کماری والا جانے کے لیے صبح کے وقت کسی سنسان سڑک پر گاڑی سے اتر کر گاؤں کی جانب پیدل سفر شروع کرتا ہے۔اسے اپنی سابقہ محبت کی تلاش ہے۔کماری والا ناول کا مرکزی کردار ضامن علی ہے جو کہ فلش بیک تیکنیک کے تحت اپنی کہانی سناتا ہے یہ تکنیک اس سے پہلے کئی ناولوں میں برتی گئی مرزا ہادی رسوا کا امراؤ جان ادا، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی وغیرہ

ناول کی کہانی گاؤں، شہر، اسلام آباد، کراچی کے درمیان گھومتی پھرتی ہے۔ناول میں ضامن علی کی زبانی ان واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ایک دیہاتی بچے نے کم سنی میں دیکھے ان تجربات نے اس کی سوچ اور کردار پر جو اثرات مرتب کیے ان کو لے کر کہانی چلتی ہے۔ناول کی فضا میں اسی کی دہائی کی مسائل جن میں ضیا دور کا جبر، غربت، افلاس، جنسی تشدد، اشرافیہ کی منافقت، پٹھانوں کی امرد پرستی، افغانیوں سے جڑے مسائل، افغان جہاد، منافقت، جو مذہبی منافرت، شعیہ مسلک کے ساتھ ہونے والے مظالم اور دیگر معاشرتی مسائل پر نشتر چلایا گیا ہے۔ایک دس سالہ بچہ ضامن جو کہ اپنی سے بڑی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور وہ کسی اور سے شادی کر لیتی ہے۔کسی بچے کا بڑی عمر کی لڑکی سے محبت می گرفتار ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ممتا سے محروم رہا ہے۔ماں کی محبت سے محرومی اسے بڑی عمر کی لڑکی کی طرف مائل کرتی ہے۔اس ناول میں ناطق ن نفسیاتی گرہیں بھی کھولی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی دوغلی سوچ اس کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہے۔اس ناول کے مطابق جہاد کے نام پر خوبصورت لڑکوں کو افغانستان لے جا کر لواطت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ناول کے دو کرداروں مولوی اور عدیلہ کے جو مکالمے ہیں وہ دیہی معاشرت میں ایک نام نہاد مولوی کے قبیح کردار اور غیر ملکی فنڈنگ کے بل بوتے پر غریب والدین کے ناسمجھ بچوں کو بطور کھلونا استعمال کرنے کی لرزہ خیز کہانی کو بیان کرتے ہیں۔اسی عدیلہ کی بیٹی اور ناول کی ہیروئن زینی جس سے ضامن علی محبت کرتا ہے ڈاکٹر فرح کے بیٹے جنید کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔کہانی زمین داروں کی روایتی جائیداد کے حصول کے لیے قتل و غارت کے واقعات بھی بیان کرتی ہے اور ہیروئن زینب کی بیٹی شیزا کی المناک موت جو کہ کینسر سے ہوتی ہے اسے بھی لے کر چلتی ہے۔کہانی کا ہیرو مسلسل تلاش میں ہے۔ یہ تلاش انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے جس

کا حاصل کچھ نہیں ہے۔جن مسائل کا ذکر ان ناول میں کیا گیا آج چالیس سال بعد وہ تناور درخت بن چکے ہیں معاشرے کی گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کی بدولت مڈل کلاس کو اپر کلاس والے مسائل کا سامنا ہے۔غریب پسے ہوئے طبقات بدستور جہالت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بڑھتے ہوئے جنسی تشدد کے واقعات اخلاقی بے راہروی کا نتیجہ ہیں۔نیٹ کی ایجاد نے حیوانیت کو مزید بڑھایا ہے۔دو گھوڑا بوسکی سے ترقی کر کے عوام brands پر تو آ گئی ہے لیکن انہی برانڈڈ ڈریسز کے حصول اور فاسٹ فوڈ کے لیے عام گھروں کی بچیاں ناجائز دوستیاں کرتی ہیں۔سیاسی سطح پر بھی حالات دگرگوں ہیں۔

علی اکبر ناطق کا ناول کماری والا ۱۲۸ ابواب اور ۸۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ناول کے کردار سماج کے جیتے جاگتے انسان لگتے ہیں۔پاکستان میں شدت پسندی، بیوروکریسی، جبری گمشدگیاں، منشیات، استحصال، ٹارگٹ کلنگ، معاشی مسائل، فیکٹریوں میں مزدوروں کا استحصال، ذخیرہ اندوزی،جنسی تشدد،اغوا برا؟ تاوان، زبردستی کی شادیاں، ہوس، گروہی اختلافات، زمین کے جھگڑے،غربت،انتقام،کرپشن،مقدمے،قتل،اور فلمی دنیا اور این جی اوز،نسلی و مذہبی شناختوں پر منظّم کمتر بنانے اور نسل کشی جیسے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر مسائل کم ہی فکشن کا موضوع بنائے جاتے ہیں۔علی اکبر ناطق کا یہ کارنامہ تو ہے کہ انہوں نے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ یہ ناول کئی سطح پر قاری سے ہم کلام ہوتا ہے۔ناول کی کہانی چلتے چلتے موجودہ آج کل کے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ضامن علی کی جوانی اور جوانی کے کارنامے کہانی میں تجسس کی فضا جو بنائے رکھتے ہیں۔اکبر علی ناطق نے مسلکی اختلاف اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قتل و غارت کو موضوع بنایا ہے۔انسانیت کی سطح سے گرنے کے بعد آدمی کیا کیا راستے اختیار کرتا ہے۔کس طرح سے معاشرے خوف و ہراس کا شکار ہوتے ہیں۔ثقافتی اور سماجی روابط کے پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی پڑھنے کے لائق ہے۔

میراجی اور شونیتا کے تصورات

وحشت میں انسان کا آخری سہارا مذہب ہوتا ہے اور جس کے پاس یہ سہارا نہ ہو تو اس کی داخلی شخصیت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ میراجی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا انہوں نے اپنی وحشت کو خود پر طاری کر لیا اور اسی وحشت نے انہیں ختم کر دیا۔ میراجی کے ظاہری حلیے کا پراگندہ پن، ان کی عجیب عادتیں، صاف گوئی اور غربت نے انہیں لوگوں کی نظروں میں منفی تاثرات کی حامل ایک مجہول سی شخصیت بنا دیا تھا۔ لوگ ان کے من میں چھپے حساس دل تک نہ پہنچ سکے اور میراجی مر گئے۔

میراجی کی شاعری اور ان کی نظموں کی انوکھی فضا، ان کے مضامین میں تنوع، ان کی وسیع سوچ اور جدیدیت سے بھرپور تنقیدی شعور نے انہیں اردو ادب کے جدید شاعروں کی پہلی صف میں لا کھڑا کیا۔ میراجی کی شخصیت نفیِ ذات کا منہ بولتا ثبوت تھی اور ان کی شاعری اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ میراجی کے شعور نے انہیں مصرعوں کی کانٹ چھانٹ سے آزاد کیا اور نظریہ شونیتا نے ان کے الفاظ کو امر کر دیا۔ شونیتا یعنی سوچنے کا ایسا قاعدہ جس کی رُو سے ایک ایسی سوچ تک آگہی کہ اس کائنات میں کچھ بھی، یعنی کوئی شے، کوئی بھی خیال، کوئی بھی نظریہ، کوئی بھی تصور، کوئی بھی اصول قائم بالذات نہیں ہے یعنی کسی شے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شونے کا مطلب ہندی میں صفر ہے۔ مطلب زیرو۔ شونیتا شونے سے ہے zero جو ایک عددی علامت ہے۔ شونیہ کے ایک معنی تو یہ ہے کہ 0۔ یعنی کہ نہیں ہے۔ اس کے مطابق اس کائنات میں موجود ہر چیز معدوم ہے۔ ہر شے پر غیاب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ حقیقت کی اصل محض ایک واہمہ ہے۔ اپنی مطلق حیثیت سے شونیتا انسانی وجود میں (جو عارضی وجود ہے عدم وجودیت یا آزادی مطلق کا احساس ہے۔

اس آزادی کے احساس کو میراجی نے اپنی شخصیت پر بھی طاری کیا اور اپنے فن میں بھی اس کو لاشعوری طور پر برتا ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں شونیتا کی جڑوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ شونیتا کی یہ نفی محض ”نہیں“ میں نہیں

ہے بلکہ وجود یا وجود کے احساس سے ورا جو وجود ہے اس کا احساس ہے، اس کی نفی بھی ہے۔شونیتا کے تصور کو بہتر طور سمجھنے کے لیے ہمیں یوں سمجھنا چاہیے کہ حقیقت یا وجود اپنی جگہ پر ہے لیکن شونیتا کی فہم کے بغیر اس کا علم ممکن نہیں ہے شونیتا انسانی وجود میں (جو عارضی وجود ہے) عدم وجودیت یا آزادی مطلق کا احساس ہے۔اسی آزادی کے احساس کو جینے کی کوشش میں میرا جی نے اپنی عجیب وغریب وضع قطع بنا کر اپنی ذات کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ وہ شونیتا کے تصور سے بخوبی واقف تھے ان کے اشعار پر ہندی کے اثرات واضح ہیں الفاظ کے چناؤ سے خیالات تک۔وہ خود کو ایک آزاد روح سمجھتے تھے لیکن جب آزاد ہو نہیں پاتے تھے تو اپنی نفی کرنے لگتے یہ ہی انداز انکی نظموں کی انفرادیت ہے۔

اندرونی کشمکش بیرونی ماحول کی شدت پسندی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی بلکہ نفی اور اثبات کا کھیل کھیلتی رہتی ہے۔ یہ ہی کھیل میرا جی کے وجود میں جاری رہتا تھا کبھی ان کے من موجی فطرت حاوی ہو جاتی اور کبھی زیر ۔جس کا اندازہ میراں جی کی حالت ناگفتہ بہ سے ہوتا۔وحشت کی بھرمار ان کے وجود میں ایسی آگ بھر دیتی کہ وہ اس آگ کو آنسوؤں سے بجھانے لگتے۔سکون آور کیف کے لیے شاید ان کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا یا وہ وجود کی نفی کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔شونیتا کے تصورات میرا جی کے مضامین میں بھی نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔ان کی نظر مغربی تنقیدی افکار پر بہت گہری تھی اور نظم نگاری کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ان کی نظمیں گہری معنویت لیے ہوئے ہیں جن کی تہہ میں کئی عناصر بکھرے ملتے ہیں جن میں نفی کا جذبہ شدت سے ابھرتا چلا جاتا ہے اور اثبات کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے قدم روک دیتا ہے وہ صفر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ سب شونے ہے۔لیکن وہ آس اور امید کا دامن بھی تھامے رکھتے ہیں۔

میرا جی کے چند مصرعے

کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے

کیوں گیسوئے پیچیدہ ورقصاں

نمناک نہیں ہے

اشک دل خوں سے

کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے

ملتی نہیں مجھ کو

بے قید رہائی

ملبوس پہ کرنوں کی تمازت

ہے دام نظر کا

اور صبح شب عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا

مرہون سحر کا

ہوتا ہی نہیں ہے

کیوں دھوئے نہ پیراہن آلودہ کے دھبے

مخمور مسرت

کرنوں کی تمازت

بن جائے نہ کیوں رنگ شب عیش کا اک عکس مسلسل

مجبور اذیت

تو مان لے اس عکس کا منظر

دیتا ہے تجھے جام چشیدہ کی سی لذت

کیوں سوچ رہا ہے

جھوٹا ہے یہ پیالہ

مشرف عالم ذوقی کا فکشن تانیثی اور ثقافتی ڈسکورس کے تناظر میں

مشرف عالم ذوقی ایسے لکھاری تھے جن کے 14 ناول اور افسانوں کے 8 مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔مشرف عالم ذوقی کا فکشن نئی معاشرتی تبدیلیوں ، وقت کے نئے تقاضوں ، گرتی ہوئی اخلاقی اقدار ،ٹیکنالوجی کی یلغار جیسے مسائل پر اپنا نشتر چلاتا ہے ۔مشرف عالم ذوقی کی دُوررس نگاہوں نے اس طوفان کی شدت کو وقت سے پہلے دیکھ لیا تھا جس کا شکار ہمارا معاشرہ ہوتا جا رہا ہے ۔آپ کے ناول اور افسانے معمولی واقعات سے پیدا ہونے والے بڑی تبدیلیوں اور ان کے نتائج کو اطرح سے لے کے چلتے ہیں کہ قاری کی دل چسپی شروع سے آخر تک متن میں برقرار رہتی ہے ۔سوچ کا در وا کرتی یہ تحریریں ایسے ایسے مسائل کا احاطہ کر رہی ہیں جو آج سے پہلے ہمارے معاشرے کر درپیش نہیں تھے ۔ناول '' لے سانس بھی آہستہ '' معاشرے کے عجیب و غریب المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں معاشرے میں بڑھتی ہوئی فریسٹریشن کا ایک مکروہ اخلاق سے گرا ہوا حل دکھایا گیا ہے ۔جو کہ غیر اخلاقی ویب سائٹس اور پھر ان کے نوجوان نسل پر اثرات کے بارے میں ہے ۔یہ آگہی تو معاشرے میں دینا اچھا قدم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک معذور لڑکی کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے جو سراسر بے سروپا ہے ۔اس کہانی میں لڑکی کے باپ کو مجبور دکھایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بے بس ہے جب کہ ایسا درست نہیں ہے ۔لڑکی کا باپ معذور لڑکی کی ناجائز مطالبات پورا کرنے کی بجائے گاؤں سے آئے لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کر سکتا تھا ۔خود کسی عورت سے شادی کر کے لڑکی کی ذمہ داری اس عورت کو دے سکتا تھا ۔کسی عورت کو ملازمہ رکھ سکتا تھا ۔مشرف عالم ذوقی صاحب نے باپ کو مظلوم ، مجبور بن کے پیش کیا ہے جب کہ باپ قابلِ مذمت ہے ۔اپنے غلط اعمال اور ناجائز اولاد کو اپنی نواسی اور پوتی قرار دے کے اپنے دل کی

توجیہ پیش کرنا کون سی اخلاقی اقدار ہیں ؟انسیسٹ (Incest) اس ناول کا بنیادی موضوع ہے ۔جس کی ہمارے مذہب اور معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ناول ’’پوکے مان کی دنیا‘‘ میں ایک جوان ہوتی ہوئی منہ زور لڑکی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے والدین کی حکم عدولی جس کی فطرت ہے ۔اس ناول میں بھی عجیب سی نفسیاتی گرہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ کچھ مردوں کی گھٹیا نفسیات کو ظاہر کرتی ہیں ۔شاید ہمارے معاشرے میں ایسے مرد بھی پائے جاتے ہیں ۔جن کی نظر کی گندگی سے محرم رشتے بھی محفوظ نہیں ہیں ۔اخلاقی گراوٹ نے معاشرے کو اس حد تک پامال کر دیا ہے کہ اب بچیاں گھروں میں بھی غیر محفوظ ہیں ۔لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے ۔پوکے مان ایک گیم ہے جس میں کھیلنے والا دشمن سے لڑ کر بہت سارے پوکے مان جمع کر لیتا ہے پھر جب کوئی لڑائی پیش آتی ہے تو وہ دشمن کے لیول کا پوکے مان میدان میں اتارتا ہے اور جیت کر دشمن کو قید کر کے پوکے مان بنا لیتا ہے ۔دیگر ویڈیو گیمز میں طاقت آپ کا مالک بننا نئی نسل کو بہت مرغوب ہے ۔یہ گیمز بچوں کی سوچ کو کیسے تبدیل کرتی ہیں مشرف عالم ذوق نے ناول میں آگے جا کر اس پر روشنی ڈالی ہے۔

’’بیٹی ماں کی گود سے نکلی اور تاڑ جتنی لمبی ہوگئی۔‘‘ یہ ذوقی صاحب کا پسندیدہ جملہ ہے۔

تو کیا چھوٹی لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح بڑھوتری کا حق نہیں ہے !ہم مسلمان ہیں ہمارے لیے بیٹی رحمت ہے ۔مشرف عالم ذوقی ہندوستانی معاشرے میں رہتے تھ شاید وہاں بیٹیاں زحمت ہوں ۔مشرف عالم ذوقی صاحب کا یہ انداز کئی افسانوں میں بھی نمایاں ہے ۔انہیں لڑکیوں کی جسامت پر اعتراض ہے ۔ان کے لباس پر اعتراض ہے ۔ان کے جوان ہونے پر اعتراض ہے ۔شاید وہ لاشعوری طور پر بیٹیوں سے نفرت کرتے ہیں ۔جدیدیت کے ترانے گانے والے بیٹیوں سے نفرت کے معاملے میں اس قدر قدامت پرست ہیں ۔یہ کیسی بیمار ذہنیت ہے ۔جس انسان کو اپنی بیٹی کے لباس پر اعتراض ہے ۔وہ اپنی بیگم کا لباس درست کروالے ۔بیٹی کا لباس اکثر ماں سے مشابہ ہوتا ہے کیونکہ وہ لاشعوری طور پر ماں کی تقلید کرتی ہے ۔بچیوں کے لباس بھی مائیں ہی خریدتی ہیں اس وقت یہ باپ کہاں مرے ہوتے ہیں ۔دیکھ لیا کریں نا بیگمات کیا خرید رہی ہیں ۔بعد میں جو نظریں چراتے پھرتے ہیں ۔لیکن وہ لباس جو بیوی کے لیے پسند ہے بیٹی کے لیے پسند نہیں ہے یعنی جو خود کے لیے پسند ہے نئی نسل کے لیے پسند نہیں ہے ۔اصل مسئلہ یہ ہے ۔ناول میں آگے چل کر معاشرے میں پھیلتی ہوئی

جدید سوچ یعنی مادر پدر آزادی کو موضوع بنا کر ایک بارہ سالہ بچے کی ریپ کی کہانی سنائی گئی ہے کہ اس پوسٹ ماڈرن عہد میں نئی نسل ہر اُس قدر کو نظر انداز کر رہی ہے جو اُس کی آزادی، اختیار اور قوتِ فیصلہ کو چیلنج کرتی ہے۔نئی نسل کو نہ تو ماضی سے دل چسپی ہے اور نہ والدین سے۔نئی اخلاقیات میں لمحہِ موجود اور ’ذات‘ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ان کے لیے زندگی کا مقصد لذت کے حصول میں ہے جو وہ گیم سے لے کر جنس تک میں تلاش کرتے ہیں۔آج دنیا کو گلوبل ویلیج بنا دیا گیا ہے۔انسان کو ایک ڈیوائس سے ساری دنیا سے جوڑ دیا گیا ہے۔لیکن فرد واحد مزید تنہا ہوتا جا رہا ہے۔پوکے مان،اسپائیڈر مین جیسے کردار نئی نسل کے پسندیدہ ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کی زیادہ تر تحریریں پیروں تلے سے کھسکتی تہذیبی و اخلاقی بنیادوں کا نوحہ ہیں۔مشرقی تہذیب و کلچر پر مغربی یلغار اور کلچرل امپیریلزم کے مُضر اثرات جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہمارے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں داخل ہو کر بالخصوص نئی نسل کے ذہنوں کو آلودہ کرنے میں مصروف ہیں ان کو مشرف عالم ذوقی نے تحریر کا حصہ بنایا لیکن ان کا حل کیا ہے؟ اور ان کی جو وجوہات ذوقی صاحب نے لکھی وہ کس حد تک درست ہیں؟ temptations کے انتخاب میں ذوقی صاحب نے عجیب قسم کے مفروضات کا سہارا لیا ہے۔ان کے خیال میں لباس ہیجان کا باعث ہے جب کہ ایسا درست نہیں ہے۔لباس اگر ہیجان کا ذریعہ بنتا ہے تو بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کیوں ہوتے ہیں۔اصل وجہ سوچ کی غلاظت ہے۔مشرف عالم ذوقی کے دیگر ناولوں میں ایک ’’مرگ انبوہ‘‘ ہے جس میں باپ بیٹے کے مابین جنریشن گیپ کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد ہندوستانی معاشرے میں پھیلتی فرقہ وارانیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔سیاسی اور معاشرتی فضا میں پیدا ہونے والا تعصب اس ناول کا موضوع ہے جو کہ جرات مندانہ کوشش ہے۔اسی ناول کا دوسرا حصہ مردہ خانے میں عورت کے نام سے لکھا گیا۔

مشرف عالم ذوقی کا تانیثی ڈسکورس نالہ شب گیر میں سامنے آتا ہے۔ثقافتی سطح پر جو نئے زاویے نمودار ہو رہے ہیں۔ان کے باوجود عورت محکوم ہے۔اصل بات یہ ہے سماجی اور مذہبی سطح پر عورت کا مقام کہاں ہے۔یہ سوال ذوقی کے ہر ناول ہر افسانے کی بنیاد ہے۔تانیث ڈسکورس ذوقی کی تحریروں میں ہمیشہ موجود رہا لیکن ’’نالہ شب گیر‘‘ میں یہ سارے ناول میں پھیلا دکھائی دیتا ہے۔عورت کا مقام آج بھی غلام کا ہی ہے بس

اُسےئی زنجیریں پہنا دی گئی ہیں۔ ذوقی نے اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت سب زنجیری توڑ کر بغاوت کر سکتی ہے۔لیکن ان کی ذہنی اپچ نے اس ناول کو بھی دیگر ناولز کی طرح سوالات کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ ہیجان کی شدت ، عجیب وغریب معاملات ، رشتہ ازدواج کے حوالے سے نئی سوچ اور بہت کچھ اس ناول میں شامل ہے۔اس ناول کی ہیروئین ناہید ناز اپنی برسوں کی نفرت کا نشانہ اپنے شوہر کو بناتی ہے اور اسے چوہا کہہ کر گھر سے بے دخل کر دیتی ہے۔'نالہ شب گیر' میں مرد مخالف تانیثی رویے کو بنیاد بنایا گیا ہے یہ مشرق بالخصوص اردو ناول کے لئے نئی بات ضرور ہے لیکن مغرب میں اس کی شروعات بہت پہلے ہو چکی ہیں۔اردو فکشن میں ذوقی نے باقاعدہ طور پر تانیثیت کے اس مکتب کے اثرات قبول کرتی ہوئی ایک مشرقی عورت کو دکھایا ہے جو اردو ناول میں ایک نئے اور منفرد تجربے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہاں بھی سوال وہی ہے کہ ناہید کے مسائل کا حل کیا ہے؟ ذوقی نے ہمارے اردگرد پھیلے نئے مسائل کی طرف توجہ تو دلائی ہے لیکن اس کوششیں میں وہ بہت آگے نکل گئے یہ بات قابل تحسین ہے کہ اس طرف توجہ دلانے والوں میں وہ سبقت لے گئے ہیں۔ یہ ہی ان کی انفرادیت ہے اور اس نئے ٹیکنالوجی کی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی ، اخلاقی مذہبی اور تہذیبی جنگ پھر اس سے نبرد آزما انسان خاص طور پر نئی نسل کس مقام پر کھڑی ہے؟ یہ مشرف عالم ذوقی کا سوال ہے۔جس کا جواب ہم سب کو سوچنا ہے۔

استعماریت اور جمہوریت

آج سے تقریباً چار سو سال پہلے فرنگی ہندوستان پر قبضے کا منصوبہ بناتے ہیں اور جنگ آزادی/غدر کے بعد مکمل طور پر ہندوستان فرنگیوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔مغل بادشاہ کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔فرنگیوں کی کاری ضرب ہندوستان کے مذہبی ثقافتی اور سماجی نظریات پر پڑتی ہے انگریز صرف ہندوستان کی دولت لوٹ لیتے تو اس قدر غم نہ ہوتا لیکن وہ تو تہذیب کے بنیادیں ہی کھوکھلی کرتے چلے گئے۔خواتین بے پردہ اور مرد سرکاری نوکری اور پینشن کے لالچی ہوگئے۔جن نوابوں کی ریاستیں انگریزوں نے لُوٹی تھیں جن نوابوں کو معمولی وظیفہ خوار بنا دیا تھا۔وہ نواب بھی فرنگیوں کی تقلید میں برطانیہ جانے لگے۔اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ولایت بھیجنے لگے۔ولایت جا کر نوجوان مادر پدر آزاد معاشرے کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ کرتے اور خوب عیاشی کرتے۔ان میں سے کوئی کوئی ہی سر سید احمد خان اور علامہ محمد اقبال بن کر لوٹتا۔اب ان سے ملنے جب نواب بیگمات جاتیں تو وہ بھی دنگ رہ جاتی۔جو برقع اوڑھ کر جاتی تھیں وہ واپسی پر مردوں کی عقل پر پڑ جاتا اور بیگم صاحبہ صرف ساڑھی یا غرارے میں تشریف لاتی اور نواب صاحب پینٹ کوٹ میں۔ پھر یہ بیگمات نجی محفلوں میں فرنگیوں کی ترقی کے ایسے قصے سناتی کہ عورتیں دانتوں میں انگلیاں داب لیتی۔اورا طرح یہ ترقی یافتہ خواتین اپنی بے پردگی کا جواز گڑھ لیتی۔لیکن ان کے اثرات کا دائرہ کار محدود تھا معاشرے کی مجموعی فضا پر ان کے اثرات تو پڑے لیکن اخلاقی گراوٹ سے معاشرہ بہر حال محفوظ ہی رہا۔نوابوں کی دیکھا دیکھی صاحب ثروت افراد بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے انگلستان بھیجنے لگے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ چلیے یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن اب زمانہ بہ بدل چکا ہے۔زمانے کے ساتھ ساتھ کہانی بھی بدل رہی ہے اور یہ بدلتی ہوئی کہانی کہاں جا کر رکے گی۔سوچنا یہ ہے! کہانی بدل رہی ہے اس لیے اب فرنگیوں کا طریقہ کار

بھی بدل چکا ہے۔ عالمی منڈی اپنی تمام تر فحاشیت اور عریانیت کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کا استقبال کر رہی ہے۔ ان کے بنائی ہوئی اخلاقیات ہماری نوجوں نسل اپنا رہی ہے۔ گلوبل دنیا اور گلوبل وارمنگ کے اس دور میں الگ الگ اخلاقیات کے عفریت ہمارے معاشرے کو حصار میں لیے کھڑے ہیں۔ اصل مسئلہ اخلاقیات کا گُم ہو جانا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی ترقی کے نام پر ہماری زندہ روایات و وراثت کو روندتے ہوئے مغرب سے اٹھنے والے ہیجان زدہ ثقافت کے بگولوں نے بہت حد تک ہماری مشرقی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ترقی، آزادی اور خوش حالی کے نام پر ہم مزید محکوم بنتے جا رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے ہر خاص و عام کے ذہن میں یہ سلوگن گونج رہا ہے کہ زندگی اپنی ہے تو پھر اسے اپنی مرضی سے جیسے چاہو جیو۔ معاشرے کی سوچ اس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ اخلاقی قدریں گرتی جا رہی ہیں۔ آج خونی رشتوں میں مفاد پرستی عام ہو رہی ہے۔

استعماری قوتوں کا تو یہ وطیرہ رہا ہے کہ استعماری قوتیں جمہوری قوتوں کو پنپنے نہیں دے سکتی۔ استعماری قوتوں کے اس جبری استبداد کا طریقہ بہت ہی بھیانک ہے۔ کسی ملک کی ثقافتی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کو یہ ایک سازش کے تحت تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل ذہنی غلامی کی نا ختم ہونے والی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جب بھی نو آبادکار کسی ملک یا زمین کو اپنی کالونی بنانے کی سعی کرتے تھے تو وہاں پہلے سے موجود سارا نظامِ زندگی بدل کے رکھ دیتے تھے۔ برطانوی نو آبادکاروں نے بھی ہندوستان سے نا صرف اسباب اور وسائل لوٹ لیے بلکہ یہاں کا سماجی ڈھانچہ ایسا بدلا کہ آج، ڈیڑھ دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم اس کو ''ڈی۔کلونیلائز'' نہیں کر پائے۔ ہندوستانیوں سے صرف ان کی زبانیں چھینی نہیں گئی بلکہ مقامی زبانوں کو کم تر قرار دے کر ان زبانوں کو لسانِ ممنوع بنانے کی کوششیں بھی کی گئی۔

ان زبانوں کی جگہ غیر ملکی زبان کو دے دی گئی مقامی سطح پر انگریزی سکول اور کالج قائم کر دیے گئے جن کا مقصد استعماری قوتوں کے اپنے مفادات میں تھا جن میں فرنگی تراجم کا سہارا لے کر انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دینے لگے اور مقامی زبانوں کی تحقیر کا ایک سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا کہ ہندستان کی زبانوں کو جدیدیت سے عاری قرار دیا گیا اور فرسودہ کہا گیا۔ نئی سیاسی حد بندیاں قائم ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ رک نہیں سکا۔ نو آبادیاتی پھیلاؤ مابعد نو آبادیات میں منتقل ہو گیا اور ذہنی غلامی، احساس کمتری، اپنی قومی زبان سے عدم دلچسپی

بڑھتی گئی۔آج صورت حال یہ ہے کہ نوجوانوں کی بڑی تعداد کج فہمی کا شکار ہے۔معاملہ صرف یہاں تک محدود نہیں ہے۔ٹیکنالوجی کی اس نئی یلغار میں اخلاقی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں۔نئی نسل تک پہنچنے والا غیر اخلاقی مواد، نامکمل علم ،مکمل شخصی آزادی کا تصور، مذہبی اقدار سے دوری اس معاشرے کی کھوکھلی جڑوں کو تیزی سے کھا رہی ہے۔خارجی ماحول کی شدت داخلی شخصیت کو ٹکروں میں بانٹ رہی ہے۔یہ سلسلہ ذاتی پسند ناپسند،لباس ،اخلاق ہر معاملے پر اثر انداز ہورہا ہے۔جدید رجحانات کے اتباع کی یہ شدت بظاہر مسائل کے حل ک کوششیں ہے لیکن در پردہ یہ دلدل میں اترنے کا نام ہے۔آج استبدادی قوتوں کا طریقہ کار بدل چکا ہے لیکن عزائم وہی ہیں جو آج سے کئی سو سال پہلے تھے یعنی حکومت کرنا۔لیکن اس دفعہ ان کا نشانہ ہندوستان کے مغل حکمران نہیں ہیں، ریاستوں کے نواب نہیں ہیں، ہندوستان کی دولت نہیں ہے بلکہ ہماری نئی نسل ہے۔وہ نسل جس کی ذہنی بالیدگی از حد ضروری ہے۔مابعد نوآبادیاتی معاشرتی صورت حال پست سے پست ہونے کی وجوہات اس احساس کمتری میں کہیں چھپی ہوئی ہیں جس کا شکار نئی نسل ہوتی جارہی ہے ٹیکنالوج کی اس یلغار کے دور میں فرد واحد مزید تنہا ہوتا جارہا ہے۔اس تنہائی اور کم مائیگی کے احساس کو کم کرنے کے لیے جو حل تلاش کیے جارہے ہیں ان کے نتائج ہماری اخلاقی قدروں سے متصادم ہیں۔جو کہ سختی سے نا قابل قبول ہیں۔انسیسٹ (Incest) جنسی ہراسگی اور جنسی زیادتی جیسے واقعات نمودار ہورہے ہیں۔جن کا آغاز ممنوعہ ویب سائٹس پر اس نوعیت کا مواد اپ لوڈ کر کے کیا گیا ہے۔

مابعد نوآبادیاتی ایجنڈے کا ایک حصہ حیوانی شہوانیت کو آخری حد تک تسکین آور بنانا ہے۔حرمت کے رشتوں کی پامالی اسی ضمن کی ایک مکروہ سوچ ہے۔جس کو معاشرے میں پھیلایا جارہا ہے۔ذہنی غلامی کی ایک شکل ڈالرز کی ترغیب ہے جو یوٹیوب اور دیگر کمائو ایپس کے ذریعے دی جارہی ہے۔معاشرے میں پیسے کا لالچ بڑھتا جارہا ہے اور حصول تعلیم کا فقدان بھی دکھائی دے رہا ہے۔بہت ہوشیاری سے ترغیبات کو ضروریات میں بدلا جارہا ہے اور پھر ان کو ترجیحات میں بدلا جارہا ہے۔ان میں ہی فرد کو الجھا دیا گیا ہے۔یہ ہی مابعد نوآباد کاروں کو مروجہ طریقہ ہے۔غلام معاشرے کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دینا۔اور اسی نئے ہتھکنڈے سے اقوام کو زیر کرنے کوشش کی جارہی ہے۔ہمارے سب مسائل درحقیقت ایک مسئلے سے جڑے ہوئے ہیں۔معاشی

بدحالی، مہنگائی، بے روزگاری، معاشرتی بے حسی اور دیگر سماجی مسائل سے پیدا ہونے والی ٹینشن۔اس ٹینشن کے اثر کو ختم کرنے کے لیے لیبینیٹ کا بے دریغ غلط استعمال کیا جاتا ہے۔تجربات کی شکل میں جرائم نمودار ہوتے ہیں۔ ہر فرد پریشان بے حال اور نا امید ہے۔قرضے دینے والے نام نہاد عالمی ادارے اپنا شکنجہ مزید کستے جا رہے ہیں۔کہانی بدل رہی ہے سماج کی سوچ بدل رہی ہے۔ ہماری ترجیحات بدل رہی ہیں لیکن ذہنی غلامی معاشی غلامی بدستور موجود ہے۔

فیمینسٹ لکھاری

مرد اور خواتین سے مل کر معاشرہ بنتا ہے یعنی کہ دونو انسان ہیں لیکن جب ہم فیمینسٹ خواتین کہتے ہیں تو گویا ایک تفریق پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ خواتین لکھاری اور مرد لکھاری الگ الگ ہیں۔لکھاری تو لکھاری ہے لیکن اگر عورت کا نام کسی نثر پارے یا شعری صنف پر لکھا ہے تو اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا مرد لکھاریوں کا اولین فرض بن جاتا ہے۔جب خواتین نے لکھنے کا آغاز کیا تو مردوں کے فرضی نام اختیار کیے یا پھر فرض ناموں سے لکھا۔ہمارا معاشرہ عورتوں کو لے کر ہمیشہ سے شدت پسند رہا اور مردوں کو لے کر جدت پسند۔پھر جب اپنے ناموں سے خواتین نے لکھنا شروع کیا تو بھی معاشرے نے تنقید کا عملی مظاہرہ لازمی سمجھا۔فیمینسٹ خواتین معاشرے کی فرسودہ روایات کی چکی میں پسنے والی ایسی مخلوق بنادی گئی کہ اظہاررا کی پاداش میں بدنامی مقدر بنی ۔شخصی آزادی کا تصور ہمارے امعاشرے میں مرد کے لیے ہے ۔عورت کے لیے غلامی کافی ہے جو وہ محرم رشتوں کی تاحیات کرے گی۔فیمینسٹ خواتین کے اظہاررائے پر پابندی لگانے والے حضرات خواتین کو تخلیق کے اس جوہر سے محروم کرنا چاہتے ہیں جو فطرت نے انہیں ودیعت کیا ہے۔فیمینزم کی تحریک کا بنیادی مقصد بھی یہ تھا کہ معاشرے میں مساوات کو فروغ دیا جائے۔ ہر جنس دوسری جنس کے برابر ہے،مرد،عورت،خواجہ سرا سب کو برابر حقوق ملنے چاہیے۔اور ترقی کے یکساں مواقع بھی۔عورتیں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کیسے کریں؟اصل سوال یہ ہے۔

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں یہاں آج بھی عورت کی آزادی کا تصور ناممکن ہے۔عورت محض جسم بن کر کب تک کائنات میں رنگ بھرتی رہے گی۔اس کے جسم سے آگے اس کا ذہن، اس کی سوچ بھی ہے ۔موجودہ دور میں خواتین کے حوالے سے سوچ بدل رہی ہے لیکن پسماندہ علاقوں میں صورت حال ابھی بھی ابتر ہے۔نئے وقت اور نئے حالات کے ساتھ چلنے کے لیے پہلے تو الفاظ کا چناؤ تبدیل کرنا ہوگا۔لکھاری یعنی رائٹر

۔فیمینسٹ رائٹر کا لفظ استعمال کرنا تو عورت کا استحصال ہے۔مرد عورت دونوں کے لیے لکھاری/ رائٹر کا لفظ ہونا چاہیے۔طاہرہ کاظمی کی کتاب ‘‘ مجھے فیمینسٹ نہ کہو’’ تانیثی ڈسکورس کی عمدہ مثال ہے۔اس سوچ کی عمدہ عکاس ہے کہ میں انسان ہوں مجھے انسان رہنے دو۔مجھے خانوں میں مت بانٹو۔

ستاروں سے آگے

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی ادبی تحریکیں مغرب سے مستعار شدہ ہیں ہمیشہ کی طرح مشرق کی غلامانہ سوچ نے انہیں اپنایا اور اردو تنقید میں یہ غالب رجحانات بن گئیں۔ اردو ادب شاعری اور افسانہ نگاری میں اس کی مثالیں بھی نظر آنے لگی۔ مگر یہاں ان ادبی تحریکوں پر بحث میرا مقصود نہیں ہے یہاں ادیبوں اور لکھاریوں کے رویے موضوع بحث ہیں۔ کیا ہمارے ادیب اور شاعر اپنی روش میں بھی جدت لا پائے یا وہی کھڑے ہیں۔ آج دنیا کے تیزی سے بدلتے حالات، عالمی وبا، اقدار کا تبدیل ہوتا معاشرتی ڈھانچہ، نئی نسل کی باغیانہ سوچ کیا ''مابعد جدیدیت'' سے آگے ''بعد مابعد جدیدیت'' کی طرف جانے کا اشارہ نہیں ہے؟ اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہم ادب سے وابستہ لوگ تو وہی کھڑے ہیں جہاں تھے۔ وہی ادبی کانفرنسیں، وہی مشاعرے وہی تقریبات۔ وہی انداز سب بدستور فرسودگی کا شکار ہیں۔

ادبی تقریبات سے خطاب کرنے والے مقررین کے وہی گھسے پٹے تنقیدی خیالات ہیں۔ سامعین میں سے اکثریت اردو ادب کے طالب علموں پر مشتمل ہوتی ہے جو تنقیدی مباحث سے آشنا ہوتے ہیں ان پر اپنی لیاقت کا رعب جھاڑنا عقل مندی نہیں ہے۔ کتاب کی تقریب رونمائی میں کتاب سے متعلق نپی تلے گفتگو کیجئے۔ شاعرات میں متشاعرات کی اکثریت ہے۔ جینوئین شاعرات آج بھی کہیں بہت پیچھے ہیں۔ کیونکہ یہ خود تک ان نام نہاد شاعروں کو رسائی نہیں دیتیں جو لامحدود رسائی کے طلب گار ہیں۔ متاشاعرات کو شعری مجموعہ لکھ کے دینے کے بعد پھر تقریبات بھی سجائی جاتی ہیں۔

کتاب کی تقریب رونمائی میں شامل نامور شاعر متشاعرہ کی اصلیت سے واقفیت ہونے کے باوجود تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ ان پڑھ خاتون کو شاعرہ بنا کے پیش کیا جاتا ہے جو کہ ایک جملہ نثر لکھنے پر بھی قادر نہیں ہے۔ پھر مشاعروں میں ان متشاعرات کے نام شامل کیے جاتے ہیں۔ ایسی متشاعرات کی مثال

سمندری جھاگ کی ہے۔سفارش کا ناسور ادب کی جڑوں میں بیٹھا ہے۔دنیا مابعد جدیدیت سے آگے دیکھ رہی ہے اور ہمارے شاعر ابھی تک عورت کے نشیب فراز میں الجھے ہیں۔صنم کی دراز زلفوں میں جکڑے ہیں۔فرسودہ معاشرہ فرسودہ سوچ صرف یہاں تک محدود نہیں ہے جامعات بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہیں اور حکومتی ادارے بھی جو کہ ادب کے نام پر بنائے گئے۔بھٹو صاحب نے شاعروں اور ادیبوں کے لیے مختص کیے۔وہاں بھی یہ ہی صورت حال ہے۔صدر نشین کے بدلنے سے حالات نہیں بدلتے۔صدر نشین تو لسٹ پر دستخط کرتے ہیں۔جو مشاعرے کے لیے متعلقہ سرکاری ملازم ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔لسٹ بنانے والے بدلیں تو حالات بدلیں۔تعلق ،سفارش ،دوستی نبھانے کی روایت لسٹ بنانے والوں کی سرشت میں ہے۔ادب سے زیادہ انہیں ادیب محبوب ہیں۔محبوب سب کے محبوب ہوں تو بات بنے لیکن یہ صرف اپنے مفادات کے محبوب ہیں۔اس پر اکتفا نہیں ہے اب ایوارڈ بھی سفارشی لوگوں کو دیے جائیں گے۔

ہمیشہ سے اردو ادب کا یہ چلن رہا اور انشا اللہ رہے گا۔دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔گروہ بندی کا شکار یہ ادیب اپنے پسندیدہ اور قریبی دوستوں کی نگارشات کو ادب نمبر ،معاصر ادب ،جدید ادب ،جدید افسانہ ،معاصر افسانہ ،جدید نظم کے نام سے چھاپیں گے۔انہیں ان جینوئین شاعروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو کہ غربت کے باعث اپنا دیوان نہیں چھاپ سکتے۔ان ادب کے جانثاروں میں سے زیادہ تر کے پاس کوئی ادب کی ڈگری نہیں ہے۔نام نہاد نقادوں کے پاس ایم اے اردو تک کی ڈگری نہیں ہے اور تنقید کرنے چلے ہی یہ شاعر نہیں ہیں اور شاعری کی کتابوں پر تنقید کرتے ہیں۔شاعروں کی کتابوں میں ان کے تعارفی مضامین بھی شامل ہیں۔ہر لکھاری کتھارسس کے لیے لکھتا ہے لیکن ایسی صورت حال اسے ڈیپریشن میں مبتلا کرتی ہے۔

آج دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ہر آنیوالا لمحہ جدت کی طرف ایک اور قدم ہے۔معاشرے کی سوچ میں تبدیلی کے ساتھ لکھاری کا چلنا بے حد ضروری ہے۔اپنے مفادات سے بالاتر ہو کے مثبت سوچ کو فروغ دینا ایک لکھاری کا فرض ہے۔سماجی ،مذہبی ،معاشرتی ،سیاسی اور طبقاتی کشمکش اور بے روزگاری کے مسائل ہمارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں بیان کیا جائے۔لکھنا بغاوت ہے لیکن باغی بننے کے لیے لکھاری ہونا بھی لازمی ہے۔جس معاشرے میں لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونے کی روایت ہو

وہاں ایسی امید کہاں ۔ نیا ادب تو وجود میں آ رہا ہے لیکن ادبی رویوں میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ستاروں سے آگے کے جہان ڈھونڈ نے کے لیے اردو ادب کو ابھی بہت سفر کرنا ہے۔

کس کی مرضی چلے گی

پاکستان اور ہندوستان ایک طویل عرصہ تک برصغیر کی شکل میں دنیا کے نقشے پہ یکجا رہے ہیں۔دونوں ممالک کی خواتین کی ایک بڑی تعداد بے شمار مسائل کا شکار ہے۔پاکستانی خواتین کو جن مسائل کا سامنا ہے۔اس میں کم عمری کی شادی،صنفی امتیاز،غذائی قلت،تیزاب گردی،طبی سہولیات کا فقدان ،دوران زچگی اموات،گھریلو تشدد،غیرت کے نام پہ قتل،جنسی ہراسگی ،ریپ اور تنگ نظری شامل ہے۔شخصی آزادی کا تصور ہمارے معاشرے میں ناپید ہے۔عورتوں کو زیادہ تر دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق جہیز کے نام پہ قتل ،تشدد اور خواتین کو زندہ جلانے کے واقعات پاکستان اور ہندوستان میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔پاکستان کی 70 فی صد خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہیں۔نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے اور مراعات یافتہ طبقے میں بھی ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔جہاں مرد کے تشدد کا شکار عورت ہے۔بظاہر ناخواندہ طبقے کی خواتین تشدد کا شکار نظر آتی ہیں۔لیکن افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے طبقے میں بھی ایسے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔جہاں تشدد کی نوعیت بدل جاتی ہے۔اس ملکِ پاکستان کی آزاد عدلیہ کا یہ حال ہے کہ آج تک غیرت کے نام پہ قتل کے باعث کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی۔

کسی انسان کو کسی دوسرے انسان جو کہ مسلمان بھی ہے کہ قتل کا اختیار کیسے مل سکتا ہے۔مرد کو عورت سے برتر سمجھنے اور عورت پہ مالک ہونے کی سوچ نے اس معاشرہ کو تنگ نظری اور جہالت کے دہانے پہ لا کھڑا کیا ہے۔تیزاب گردی عام ہے۔اور جب تنگ نظری کی مثالیں خواندہ طبقے میں نظر آئیں تو ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔40 فی صد عورتیں ایسی ہیں جو کہ جسمانی، ذہنی اور جنسی تشدد کا شکار ہونے کے باوجود آواز نہیں اٹھاتیں۔نہ ہی کسی فلاحی یا حکومتی ادارے سے مدد لیتی ہیں۔حالات کی بہتری کی امید پہ یہ سب کچھ سہتی رہتی ہیں۔ہمارے معاشرے میں بعض اوقات شوہر کا تشدد عورت کو خودکشی جیسا سنگین راستہ اختیار کرنے پہ مجبور کر

دیتا ہے۔اسکولوں، کالجوں اور دفتروں میں خواتین کو ہراساں کرنا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ ہر وہ عورت جو گھر سے باہر قدم نکالتی ہے مرد کے لیے آسان ہدف ہے۔کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے سب سے پہلے تو اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔حکومتی اور سماجی سطح پہ عورتوں کے مسائل کو سمجھنے،قوانین بنانے اور ان پہ قوانین پر عمل درآمد کروانے کی ضرورت ہے۔خواتین کے مسائل پہ خواتین کے ساتھ ساتھ مرد حضرات کی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارا نصاب بھی ایسا ہونا چاہیئے جو مرد اور عورت کے درمیان مساوات پر زور دے۔خواتین کو برابری کے حقوق صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جب وہ معاشی طور پہ اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوں اس کے لئے تعلیم از حد ضروری ہے خواندگی کی بلند سطح ہی عورت کے مسائل کا حل ہے۔

مرا جسم مری مرضی جیسا نعرہ لگانے والے بھی عورت کے مسائل کا حل ہی ڈھونڈنا چاہتے ہیں یعنی کہ عورت کو خود مختاری حاصل ہو۔خود مختاری جب مذہب سے متصادم ہوگی تو وہ ایک اسلامی جمہوریہ میں قابل عمل نہیں ہوسکتی۔مرا جسم مری مرضی ایک ایسا نعرہ ہے جو کہ عقل و دانش سے متصادم ہے۔انسان جبر اور قدر کے فلسفے کے تحت زندگی گزارتا ہے جتنا اس کو اختیار حاصل اس میں انسان اپنے جسم پر اپنی مرضی نہیں چلا سکتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ انسانی جسم پر کس کی مرضی چلے گی۔انسانی جسم ایک قالب ہے جو کہ دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے ہم انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔مرا جسم مری مرضی جیسا نعرہ لگانے سے نہ تو عورت کے مسائل کا حل ہوگا نہ اس کو مساوی درجہ ملے گا

ساختیات، پسِ ساختیات اور ہم

اردو ادب میں نئے تنقیدی رجحانات وقت کی ضرورت تو ہیں لیکن یہ اردو ادب کے طالب علموں تک محدود ہیں ۔اردو ایک ملواں زبان ہے۔ یہ زبان مسلمانوں کی ساختہ ہے۔لیکن آج یہ تیزی سے زوال پذیر ہے۔اس زبان میں دنیا کی کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں یہ ایک ملغوبہ زبان ہے۔آج اس زبان میں ہند یورپی خاندان کی مقبول ترین زبان انگریزی کے الفاظ اس قدر راہی حاصل کر گئے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب اردو زبان انگریزی کی ایک ذیلی زبان کے طور پر جانی جائے گی۔

آج اردو پاکستان کی دفتری اور قومی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کے چھ صوبوں کی دفتری زبان ہے۔ پاکستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود یہ مکمل طور پر دفتری زبان نہیں ہے۔انگریزی میں دفتروں میں تحریری کام کیا جاتا ہے۔انگریزی فخریہ طور پر بولی جاتی ہے۔گرائمر اسکولوں نے اس انحطاط کو مذید تقویت پہنچائی ہے۔اردو کا یہ زوال ساختیات کا زوال نہن ہے ساختیات کیا ہے۔لفظوں کے درمیان باہمی تامل اور ہر لفظ کی مکمل ساخت کے مخصوص انداز کی پہچان کا مطالعہ ساختیات کہلاتا ہے۔صوتیے کو کسی لفظ کی صوتی کیفیت معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن لسانیات میں لفظ کے اندر موجود ساختیہ کو معلوم کیا جاتا ہے اور ساختی تبدیلی پر توجہ دی جاتی ہےساختیہ کی رکنی کیفیت کو بدل دینے کا نام ہی ساختی تبدیلی ہے۔

یہ تبدیلی کیسے کہاں اور کیوں واقع ہوئی اصل بحث یہ ہے زوال پذیر زبان بھی مسلسل ساختی تبدیلی سے گزرتی رہتی ہے۔پس ساختیات میں متن کے آخری معنی کی تلاش کی جاتی ہےپس ساختیات کیا ہے؟ ایک ایسا عمل جس میں پیش کیے گئے متن میں کثیر معنویت اور مرکز گریزگی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔پس ساختیات میں کسی بھی متن کو آزادانہ طور پر پڑھا جاتا ہے اور ادب کو لامحدود سطح پر پیش کیا جاتا ہے۔یعنی متن اپنے لکھے ہو؟ معانی سے آگے کے معانی بھی بیان کرتا ہے اور ایسے معانی کی تلاش ہی پس ساختیات کا مقصود ہے۔یعنی متن میں پرت در پرت معانی تلاش کرنا۔لہذا اس کے مطابق کسی بھی متن کو بند متن نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ

''ٹی۔ایس۔ایلیٹ'' جوکہ مغربی نقاد ہے ساختیاتی نقادوں کو لیموں نچوڑوں کا دبستان قرار دیتا ہے۔دیکھا جائے تو یہ درست بھی ہے آخری قطرہ تک رسائی یعنی آخری معانی تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے۔زبان متغیر ہے۔یہ ہرلحہ تبدیل ہورہی ہے۔اس میں نئے الفاظ بن رہے ہیں۔ساختی تبدلیاں ہورہی ہیں۔لفظ نثر اورنظم دونوں کا موضوع ہے۔الفاظ سے جملے بنتے ہیں۔ہر زبان کی گرائمر کے قوانین ان جملوں کی ترتیب مرتب کرتی ہے۔ساختیات ان تبدیلیوں کا جائزہ لیتی ہے جووقت کے ساتھ ساتھ الفاظ میں یعنی زبان میں مرتب ہوتی ہیں۔

ساختیات کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا کسی زبان کے انہدام کی صورت میں کوئی نئی زبان وجود میں آے گی جس میں اس علاقے کے باشندے اپنا مافی الضمیر بیا کریں گیا ورساختی تبدیلیوں کا یہ عمل جاری ساری رہے گا۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مشہور زمانہ تصنیف ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' اس ضمن کی نمائندہ تصنیف ہے۔ہندوستان کے حوالے سے اس میں کافی مواد ہے۔اب ساختیات اور پس ساختیات کا ہماری زبان اردوسیموجودہ تعلق کس مقام پر کھڑا ہے۔اس سوال کا جواب بہت مایوس کن ہے اردو زبان ہی صرف زوال پذیرنہیں ہے اردوادب کی اصناف افسانہ اورشاعری دونوں زوال پذیر ہیں کوئی نیا افسانہ نگار دکھاء نہیں دیتا۔

شاعری کا معیار مشاعروں کے صورت حال سے دکھائی دے رہا ہے جدت کے نام پر بدعت پر زور ہے ۔انگریزی الفاظ کی بھر مار ہے۔کلاسیکی استادوں کا تتبع نظرنہن آتا۔شاعروں نے اپنا ہی جہان نو آباد کرلیا ہے۔اس نظام شمسی کے سورج بھی وہ خود ہیں اورستارے بھی۔اردو مضمون سے طالب علم دور بھاگتے ہیں ۔ادبی میلوں کے نام پر دوستیاں نبھاء جاتی ہیں۔تعلق اور سفارش پر ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔لمبے نوٹ کمائی جاتے ہیں اپنوں کونوازا جاتا ہے۔اردوزبان کی بساط لپیٹنے والے بھی اردو کے متوالے ہی ہیں یہ ہی لنکا ڈھا ئیں گے انشااللہ۔

اینٹ گارے کی کھرچن

شازیہ مفتی کی کتاب اینٹ گارے کی کھرچن ان کی پہلی کتاب ہے۔شازیہ مفتی نے یہ کتاب مجھے جولائی 2019ء میں عطا کی تھی ۔اس کتاب کی تقریب رونمائی اکادمی ادبیات اسلام آباد میں منعقد کی گ ء تھی ۔میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔تو بہت متاثر ہوئی۔شازیہ مفتی کی یہ کتاب بہت توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے اس میں آپ نے زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو جمع کیا ہے۔فی زمانہ سوشل میڈیا کے دور نے ہر انسان کو مصروف کر رکھا ہے کتب بینی کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے زیادہ تر تحریریں آن لائن پڑھی جاتی ہے۔اب کتاب کا خمار قصہ پارینہ بنتا جارہا ہے۔ہمارے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں کتاب بہترین تفریح ہوا کرتی تھی اور فراغت میں بہترین مشغلہ بھی۔جلدی جلدی ضروری کام نپٹا کے کتاب ہاتھوں میں لے کے ہم ایک نئے جہان میں گم ہو جاتےتھے۔شازیہ مفتی کی کتاب میں وہی زمانہ رواں دواں ہے۔آپ اسی ماضی میں گم ہیں پہلا نثر پارہ جس کا نام ''اینٹ گارے کی کھرچن'' ہے۔اس نثر پارے میں مصنفہ نے مختلف گھروں سے متعلق مشاہدات قلم بند کیے ہیں اسی نثر پارے پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔

اس نثر پارے مصنفہ کو گھروں کی آنکھیں اور کان دل اور بانہیں پکارتے اور دھتکارے دکھائی دیتے ہیں گھر بھی مکینوں کے مزاج میں ڈھلتے نظر آتے ہیں وہ چند بے رس چہروں اور سفید بالوں والی خواتین کی دردناک موت کا قصہ سناتی ہیں جن کو وقت روند کے آگے بڑھ جاتا ہے لکشمی دیوی اور گلابو دیوی کے گھروں سے جڑے واقعات اور تقسیم کے حالات بیان کرتی ہیں۔

پھر موجودہ دور سے ماضی کا موازنہ کرتی ہیں کہ وضع داری کا وہ دور اب نہیں رہا۔زمانہ بدلتا ہے اور بدلتا چلا جاتا ہے۔اب گھر خلوص اور تہذیب کے گہوارے نہیں رہے۔اب تو گھر اسٹیٹس سمبل بن چکے ہیں اپنی دولت کی نمود و نمائش کا بہترین ذریعہ۔پہلے گھر ضرورت کے تحت بنا؟ جاتے تھے مکینوں کے مطابق۔اب تو جتنا

بڑا گھر ہوا تنے کم مکین اس میں رہتے ہیں۔ یورپ کی طرح یہاں بھی پیشگی اطلاع دے کر رشتہ داروں کے گھروں میں جانے کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ بے تکلفی کی جگہ تکلف نے لے لی ہے۔ مصنفہ نے بدلتی ہوئی تہذی کے نوحے کو گھروں کے موازنے کے ذریعے بیان کرنے کی کوشیش کی ہے۔ دوسرا نثر پارہ "قمیضیاں چھینٹ دیاں " کے عنوان سے ہے۔ برانڈز کے زمانہ نے چھینٹ ک کپڑے کو آوٹ اُف فیشن کر دیا ہے۔ سلائی تو اب پرانا فیشن ہو گیا خواتین کے پاس اب سلائی کا وقت کہاں۔ دیگر موضوعات میں ''ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار'' شجر کاری مہم سے متعلق ہے۔

''اطلاع عام'' سیل فون اور نیٹ کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' عزیز رشتہ داروں کے منافقانہ رویے سے متعلق ہے جو ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ گنبدکی آواز، بدلتی سوچ، میرا چہرہ اور دیگر نثر پارے جن کی مجموعی تعداد بیالیس بنتی ہے۔ ان سب میں مصنفہ نے باریک بینی اور عمیق مشاہدے سے کام لیا ہے۔ خواتین لکھاریوں کی تحریروں میں ماضی پرستی اور اداسی کی فضا عام ملتی ہے۔ شازیہ مفتی صاحبہ بھی اداسی اور ماضی سے جڑی ہوئی ہیں۔

دل بھی پایا تو بِلا کا زود رنج
اک اداسی گھیرے رہتی ہے اسے

(نادیہ عنبر لودھی)

آپ پرانی نسل اور نئی نسل کے درمیان کھڑی ہیں۔ پرانی نسل کی روایات اور نئی نسل کی ترجیحات اور ان دونوں کے درمیان بڑھتے ہو؟ جنریشن گیپ کو بہت نفاست سے بیان کرتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مصنفہ نے زبان و بیان کے معاملے میں اردو زبان کو بخوبی نبھایا ہے۔ طرزِ تحریر میں معیاری زبان کا رنگ نمایاں ہے۔ مصنفہ کی مادری زبان اردو ہے۔ لہذا زبان پر ان کو قدرت حاصل ہے۔

الفاظ کا چناؤ بھی خوب کیا گیا ہے۔ محاوروں کی چاشنی، تحریر میں سلاست اور روانی نے اسلوب کو عمدگی اور انفرادیت بخشی ہے۔ شازیہ مفتی صاحبہ شاعرہ بھی ہیں اور بہترین افسانہ نگار بننے کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔ یہ ان کا اولین نثری کارنامہ ہے۔ آپ خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ لکھنے کا شوق بھی پورا کرتی ہیں

۔جو کہ قابل تحسین ہے ہر لکھاری کے مقام کا تعین اس کے بعد آنے والا عہد کرتا ہے۔یہ کتاب نہ تو افسانہ کی کتاب ہے نہ انشائیہ کی ۔یہ نثر پارے کی کتاب ہے جن میں مصنفہ نے کمالِ فن دکھایا ہے ۔مولا مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔

آوے کا آوا

مملکت خدادِ پاکستان کی کیا بات ہے۔ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ بارش کا آنا عذاب ہے اورنا آنا بھی عذاب ہے۔ ذہنی معذور چوروں کا منہ چڑانا دردناک موت کو دعوت دینا ہے۔ ہاں بڑے چوروں کے لیے یہاں کھلی معافی ہے۔ اب چور تو ہر میدان میں ہیں۔ برینڈز کے نام پر لان کا جوڑا ہزاروں روپے میں بیچنے والے کیا ہیں۔ ناجائز منافع کمانے والے کیا چور نہیں ہیں؟ تعلیمی اداروں کے نام پر ماں باپ کولوٹنے والے کالجز، یونیورسٹیز، اکیڈمیز اور اسکول کیا کر رہے ہیں؟ جن خواتین کی شادیاں نہیں ہو پاتیں وہ گلی محلے کے پرائیویٹ اسکولوں میں استانیاں لگ جاتی ہیں۔ ننھے کچے ذہنوں کی آبیاری ان ناخواندہ ہاتھوں میں دے دی جاتی ہے۔ پھر پرائیویٹ ایم۔اے کر لیتی ہیں اور سرکاری اسکولوں میں نوکری حاصل کر لیتی ہیں یہاں تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ پرائیوٹ اسکول والے کام لے لے کے ان کی گت بنا دیتے ہیں چنانچہ باقی زندگی یہ آرام فرماتی ہیں اور ماضی کی تھکن اتارتی ہیں۔

اب مہنگے پرائیویٹ اسکولوں والے فیسز کے نام پر بھاری رقم بٹورتے ہیں۔ پھر شام میں اکیڈمیز میں ٹیوشن کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ کالجز والے بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی اکیڈمیز انٹری ٹسٹ کی تیاری کے لیے موسم گرما کی چھٹیوں سے خوب فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بچوں کے والدین چھٹیوں کی فیس ادا کرتے ہیں۔ اور بچے گھر میں ماؤں کا دماغ کھاتے ہیں۔ آج کے بچوں کا اہم مسئلہ؟ فوڈ چوزنگ بھی ہے جو کہ ماؤں کے لیے ایک الگ دردسر ہے۔ اب کالج کے اسٹوڈنٹ تو گھر بیٹھے ہیں۔ انٹری ٹسٹ دینے والے جو کہ مستقبل کے ڈاکٹرز ہیں۔ خطیر رقم دے کر ان اکیڈمیز میں داخلہ لیتے ہیں۔ دور دراز علاقوں کے رہائشی ہاسٹلوں کے

اخراجات بھی سہتے ہیں ۔میڈیکل کے انٹری ٹسٹ کی تیاری کروائی جاتی ہے۔SHU کے تحت اسی ہزار طلبا نے اس سال ٹسٹ دیا۔میڈیکل کی سیٹس 3600 ہیں ۔ٹسٹ دینے والے طلبا پرسینٹیج کے حساب سے fsc میں اسی فی صد سے زیادہ نمبر لیتے ہیں بلکہ نوے فی صد نمبر لے کربھی اندیشوں کا شکار ہیں پھر تین ماہ سولی پے لٹک کے انتظار کیا جاتا ہے۔اب جن کو داخلہ مل گیا ان کا تو بیڑا پار رہوا۔باقی کیا کریں؟

یونیورسٹیز کے ایڈمیشن اور انٹری ٹسٹ تو جون جولائی اگست میں ہو چکے ۔ستمبر سے بی ۔ایس کی کلاسز شروع ہوگئی۔اب یہ بچارے اگلے سمسٹر کا انتظار کریں گے۔پاکستان میں سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار تعلیمی ادارے کا قیام ہے ۔اس کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے بس پیسہ جیب میں ہو تو چاندی ہی چاندی ہے ۔اسکول کھولیے۔کالج بنایئے ۔پرائیویٹ یونی ورسٹی سجایئے ۔پیسے کمائیں ۔مزے اڑائیں ۔اس طریقے پرعمل کر کے آپ بلیک منی کو وہائٹ بھی کر سکتے ہیں اور اپنی جہالت کو بھی چھپا سکتے ہیں ۔یہ ایسا منافع بخش کاروبار ہے۔جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔اس تنزلی کا سب سے زیادہ شکارتعلیم کا میدان ہے۔نصاب برسوں پرانا رائج ہے۔وہی گھسے پٹے طریقے ہیں ۔یہاں گریڈز اہم ہیں لہذا رٹو طوطے کامیاب ہیں ۔شوقیہ پڑھنے والوں کو کسی یونی ورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا کیونکہ وہ رٹو طوطے نہیں ہوتے ۔یہ ہی وجہ ہے کہ پاکستان کی کوئی یونی ورسٹی ورلڈ رینکنگ (بین الاقوامی یونی ورسٹیوں کی لسٹ) میں پہلے دس نمبروں میں اپنی جگہ نہیں بنا سکی ۔طب کے میدان میں بھی یہ ہی حال ہے۔کروڑوں روپے انٹری ٹسٹ کے ضمن میں کمایا جاتا ہے۔ڈاکٹری کی ڈگری لینے والوں کا معیار آج دنیا میں پست ترین ہے۔ایک ریسرچ کے مطابق پاکستانی ڈاکٹرز کو مہنگا اور نکما ترین قرار دیا جا چکا ہے۔کیونکہ تعلیم کاروبار بن چکی ہے۔

پاکستانی یونی ورسٹیوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی لیول پر انٹری ٹسٹ کے نام پر لاکھوں کی کمائی کو وطیرہ بنایا ہوا ہے جب کہ یہ داخلہ صرف اپنی یونی ورسٹی کے سابقہ سٹوڈنٹس کو دیتے ہیں۔یعنی اپنی کلاس کو ہی آگے لے کر جاتے ہیں پھر سفارشی امیدواروں کو بھی تو داخلہ دینا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ہاں! سفارش مگر وائس چانسلر کی ہونی چاہیے۔انٹرویو لسٹ میں چند گھنٹے کے بعد تین چار امیدوار مزید شامل کر دیے جاتے ہیں۔پنسل

سے نمبرنگ کی جاتی ہے۔ پھر نیچے والے سفارشیوں کو لسٹ میں اوپر لایا جاتا ہے۔ اب رٹو طوطوں کی باری ہے۔ اے پلس گریڈ لینے والے یہ طالب علم رٹے مار کے اے پلس گریڈ لے لیں گیلہٰذا ان کو انٹرویو میں صرف نام اور جی پی اے پوچھا جاتا ہے۔ لیجئے اردو زبان کی طرح ملواں لسٹ تیار ہے۔ کھچڑی زبان کے امیدواروں کی کھچڑی لسٹ تیار ہے۔ تخلیقی اور زرخیز ذہن کے مالک افراد کو یہ داخلہ نہیں دیں گے کیونکہ ذہانت ان کا معیار نہیں ہے۔ ان کا معیار ان جیسے لکیر کے فقیر ہیں جن کے سامنے ان کے علامہ ہونے کا پول نہ کھل سکے۔

ایسے فارمولوں پر عمل کے باوجود ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ آے دن ان نام نہاد جامعات جہاں تعلیم نہیں کاروبار کیا جاتا ہے۔ ان میں اعلی تعلیمی ڈگریوں کے پروگرامز پر CEH کی طرف سے پابندی لگ جاتی ہے۔ دو تین سال کا عرصہ ان کا فیسوں کا کاروبار بند ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے رٹو طوطے طالب علم تھیسس اور کریڈٹ آورز مکمل نہیں کر پا؟ پھر یہ سلسلہ دوبارہ جاری ہو جاتا ہے۔

رٹو طوطے ڈگری لے کر تعلیمی میدان میں استاد بھرتی ہو جاتے ہیں۔ سینئر سبجیکٹ ٹیچر بن جاتے ہیں اور مزید رٹو طوطے پیدا کرتے ہیں۔ ہر انسان جو دنیا سے لیتا ہے وہی لوٹاتا ہے۔ سرکاری اسکولوں کے تعلیم یافتہ احساس کمتری کے مارے رٹو طوطوں سے جو انہوں نے سیکھا ہے وہی اگلی نسل کو منتقل کریں گے۔ یہاں نہ نظام بدلے گا نہ پاکستان سنورنے گا۔ جو انسان ہر میدان میں ناکام ہو جاتا ہے وہ پاکستان میں استاد بن جاتا ہے اور قوم کی تعمیر کا ٹھیکے دار بن جاتا ہے۔ جیسے استاد ویسی قوم۔ پڑھے لکھے جاہلوں کی رٹو طوطا جماعت۔ یہ ہیں مستقبل کے معمار۔

مادری زبانیں

انسان کی تہذیب و معاشرت اس کی زبان سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جیسے جیسے انسان تہذیب سے آشنا ہوتا گیا زبانوں کا ارتقاء عمل میں آتا گیا۔ زمانۂ قدیم میں لوگ قبائل کی شکل میں رہتے تھے ان کی زبانیں بھی مخصوص تھیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اختلاط رونما ہوتا گیا اور نئی زبانیں بنتی گئیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔

بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ایک گمشدہ قبیلہ سفر کرتا ہوا موجودہ افغانستان اور خیبر پختونخواہ کے علاقوں میں آ کے آباد ہوا۔ یہ پشتو زبان بولتے تھے۔ ان میں سے کچھ پٹھان خاندان دہلی کی طرف ہجرت کر گئے دہلی پہ حکمران ہوا اور وہاں آباد ہو گئے اب جن علاقوں میں یہ آباد ہوئے ان علاقوں کی زبانیں ان کی اپنی زبانیں بنتی چلی گئی اور یہ پنجابی اور اردو بولنے لگے تقسیمِ ہندوستان کے بعد ان میں سے کئی خاندان پاکستان ہجرت کر گئے۔ ان کی مادری زبانیں دو ہو گئیں۔ آباؤ اجداد کی زبان پشتو اور والدین کی زبان پنجابی/ اردو۔

آج پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جو کہ پسماندہ علاقوں میں اسکولوں میں بھی رائج ہیں۔ بول چال کی عام زبان اردو ہے۔ یہ انٹر تک لازمی مضمون کی حیثیت سے نصابی زبان ہے۔ اردو زبان کا ادب پیدا تو ہو رہا ہے لیکن شاعروں ادیبوں کا کوئی پرُسانِ حال نہیں ہے۔ یہ کتابیں لکھتے ہیں چھپواتے ہیں اور پھر تحفتاً بانٹتے ہیں۔ e۔books کی صورت میں بھی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ کتب بینی کا رجحان تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ تعلیمی میدان میں ایسے انگلش میڈیم اسکولوں کا رجحان بڑھ رہا ہے جہاں اسکول میں انگریزی بولی جاتی ہے گھر پہ والدین بھی انگریزی بولتے ہیں۔ ان اسکولوں کے طالب علم اردو زبان سے تیزی سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں۔ مادری زبانوں کا عالمی دن ۱۲ فروری کو منایا جاتا ہے۔ کسی بھی زبان کی ترویج کے لیے اس زبان میں بول چال لازمی ہے۔ کتابیں چھاپنے سے مادری زبانوں کو فروغ ملنا مشکل ہے ہاں اس زبان

کے ادب میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بچہ وہی زبان بولے گا جس میں اسکیوالدین اس سے مخاطب ہونگے۔ مادری زبانوں کی ترویج کے لیے انڈس فورم لوک ورثہ کے اشتراک سے مادری زبانوں کا میلہ ہر سال اسلام آباد شکر پڑیاں میں سجاتا ہے جس میں مادری اور علاقائی زبانوں میں لکھی گئی کتب کے لکھاریوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ مادری زبان کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے اس سال بھی 16 / 17 فروری کو یہ میلہ سجایا گیا جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ اردو زبان کے ادب اور مادری زبانوں کی ترویج کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ہماری ثقافت ہماری پہچان ہے اور ہماری آنے والی نسلوں کی امین بھی ہے۔ نئی نسل کو ان سرگرمیوں کا حصہ بنانا از حد ضروری ہے۔ اسی میں ہماری زبان کی بقا ہے۔

جنسی ہراسگی

حضرت آدم کی تخلیق کے بعد ان کے دل بہلاوے کے لیے عورت یعنی اماں حوا کی تخلیق کی گئی۔ حضرت آدم دنیا میں بھیج دیے گیئے۔ ہابیل قابیل کے جھگڑے سے شروع ہونے والی عورتکے حصول کی داستاں جاری ہے۔ بچپن میں جنسی تشدد کا شکار ہونے والی بچیاں زیادتی کے بعد موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔ لیکن اکثریت کا معاملہ جنسی ہراسگی تک ہی رہتا ہے۔ یہ بچیاں بڑے ہونے کے بعد بھی اس عمل سے گزرتی رہتی ہیں۔ آج معاشرہ خواندگی کی سطح کے لحاظ سے تو ترقی کر رہا ہے لیکن عورت کا یہ مسئلہ جوں کا توں ہے پڑھی لکھی ان پڑھ سبھی اس کا شکار ہوتی ہیں۔ زیادہ تر زبان بند رکھتی ہیں۔

فیکٹریوں میں کام کرنے والی غریب لڑکیاں، جاگیرداروں کے ہاریوں کی عورتیں، ملازمت پیشہ خواتین، نرسیں، گھروں میں کام کرنے والیاں، غرضیکہ ہر جگ عورتیں آسان شکار ہیں۔ پرائی عورت مرد کے لیے ایک کھلونا ہے۔ دل بہلانے کا سامان ہے۔ جس کے لیے وہ موقع تاکتا رہتا ہے۔ انسان کی جبلت جس کے دو "سرے" ہیں۔ ایک سرے پہ بھوک اور دوسرے سرے پہ جنس ہے۔ انسان کو اپنی اس فطرت سے مفر نہیں ہے۔ بہت عام سا قاعدہ ہے جس مرد سے بھی کوئی کام پڑے گا وہ عورت کو چھیڑے گا ضرور۔ جتنی اسے جگہ ملے گی اتن حد تک جا؟ گا۔ کیا عورت ہونا کوئی جرم ہے جس کی سزا بنتِ حوا پاتی رہے گی۔ جنسی ہراسگی ہر سطح پر ہے۔ نامور خواتین ہوں یا عام عورتیں۔ عورت کا وجود کشش اور رعنائی سے بھرپور ہے۔ اسیلئیے اسلام اسے پردے میں مقید کرتا ہے لیکن پردہ بھی عورت کا تحفظ نہیں کر پاتا۔ اصل مسلۂ سوچ کا ہے۔ شعور کا ہے۔ لیکن دیگر ناقابل حل مسائل کی طرح اس مسلئے کے سلجھنے کی بھی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

باندیاں

مرے مالک کیا ہم باندیاں ہیں

میرے مالک

کیا ہم باندیاں ہیں

جو آگ میں جلا کر ماردی جائیں

ہم وہ جوانیاں ہیں

محبت کے نام پر جو مسل دی جائیں

ہم وہ کلیاں ہیں

ہوس کا نشانہ بنا کر

جن کے پر نوچ لئے جائیں

ہم وہ تتلیاں ہیں

جو مصلحت کے نام پر

قربان کردی جائیں ہم وہ بیٹیاں ہیں

جو وراثت سے محروم کر دی جائیں

ہم وہ بہنیں ہیں

میرے مالک

کیوں ہم باندیاں ہیں

بابِ اختیار سے اذنِ سفر ہم کو بھی دے

پرواز کے لیے وسیع گگن ہم کو بھی دے

باندھ ہمارے قدموں سے کوئی منزل
اتباع کرنے والوں کا کوئی
لشکر ہم کو بھی دے
مرے مالک
آخر کب تک
ہم باندیاں ہیں!
(نادیہ عنبر لودھی)

آخری صدی کتابوں کی

پاکستان میں کئی اقسام کی کتابیں چھپتی ہیں جن میں سے کچھ تو اس لئے مجبوراً پڑھی جاتی ہیں کہ یہ نصابی کتب ہیں لہذا ان کو پڑھنا مجبوری ہے۔ یہ خریدی جاتی ہیں کیونکہ خریدنا لازمی ہے۔ رٹی جاتی ہیں کیونکہ امتحان پاس کرنا کامیابی ہے۔ دوسری قسم کتابوں کی غیر نصابی کتب پ مشتمل ہے اس میں دینی کتابیں، حکیمانہ کتابیں اور ادب کتابیں (شاعری، افسانہ، ناول) وغیرہ شامل ہیں۔

دینی کتابیں بانٹی جاتی ہیں خریدی جاتی ہیں تحفتاً دی جاتی ہیں۔

ادبی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور بانٹی جاتی ہیں ان کو خریدنے والے دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں کسی شاعر/افسانہ نگار/ناول نگار کے لیے صاحب کتاب ہون سند ہے لیکن قاری کے لیے صاحب ادراک ہونا سند نہیں۔ پاکستان میں اردو ادب تنزلی کا شکار دکھائی دیتا ہے کتب بینی کا مشغلہ بے وقت کی راگنی بن چکا ہے چند سال قبل کتب بینی محبوب مشغلہ تھی۔ مرا بچپن نونہال، تعلیم وتربیت اور اشفاق احمد کے ناول پڑھتے گزرا۔ لیکن مرے بچوں کو کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اردو ان کینز دیک مشکل ترین نصابی مضمون ہے اشعار انہیں یاد نہیں ہوتے۔ اردو لکھاء کا مسل؟ دردسر بنا رہتا ہے۔ مری اردو سے محبت ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

آج کی نسل کو کتابوں کی دنیا بہت روکھی پھیکی دکھائی دیتی ہے وہ بڑی یا چھوٹی سکرین میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ کارٹون ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ لطف جو کتب بینی میں پنہاں ہے اسے سمجھنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ لکھاری کی انگلی پکڑ کے قاری جن فہم و فراست اور درون بینی کی وادیوں سے گزرتا ہے وہ وادیاں کارٹون کے شوخ رنگوں میں کہیں گم ہو کے رہ گئی ہیں۔ پھر یہ نئی نسل پیزا، برگر اور فاسٹ فوڈ کی دیوانی ہے تو تعجب کیسا!

جن بچوں کو نیٹ تک رسائی حاصل ہے ان کے اندر سے حیرت اور استعجاب کی معصومیت ختم ہو رہی ہے۔
کارٹون میں بچوں کو جنسی تعلیم دی جاتی ہے۔

اچھی باتیں سیکھتا تو کوئی نظر نہیں آتا۔ کتاب کی جگہ آئی پیڈ، لے رہے ہیں۔ آئی بکس پڑھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے کتاب مسلسل نظر انداز ہوتی جا رہی ہے۔ آئی بکس پڑھنے والے بھی تعداد میں بہت کم لوگ ہیں۔

شاعری کی کتاب تحفتاً بھی مل جا؟ تو کوئی نہیں پڑھتا۔ گوگل اور فیس بک پہ اشعار پڑھنے کا رجحان کافی اچھا ہے افسانے اور ناول کو فیس بک اور گوگل پہ بھی کوئی خاص پزیرائی حاصل نہیں۔ نثر شاعری کے مقابلے میں غیر مقبول دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس رجحان نے معیار کو گرا دیا ہے۔ غیر معیاری کلام کو بڑے بڑے شاعروں سے منسوب کر دیا جاتا ہے اقبال اور فراز سے جوڑ دیا جات ہے۔ اردو لغت اور انگریزی ڈکشنری کی جگہ ایپ نے لے لی ہے۔

نیٹ کے بے شمار فوائد بھی ہیں لیکن یہاں کتاب کے حوالے سے تبصرہ ہو رہا ہے کہ کیا کتاب بھی ایک دن نوادرات میں شامل ہو جا؟ گی یا اس کی اہمیت پہ کوء عملی قدم اٹھایا جا؟ گا! جب کہ مغربی ممالک میں پاکستان کے برعکس صورتحال ہے۔ وہاں کتاب کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ کثیر تعداد میں کتابیں پڑھی اور چھاپی جاتیں ہیں۔ پبلک پلیسز پہ افراد مطالعے میں گم نظر آتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں افراد موبائل میں گم دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ محافل میں بھی لوگوں کی ایکتعداد موبائل میں مصروف نظر آتی ہے۔

اخبار پڑھنے کا رجحان بھی موبائل فونز اور کیبل کی سہولت کی نظر ہو چکا ہے۔ خبریں سنائی دیتی ہیں دکھائی دیتی ہیں تو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن یہ سب رجحانات صحت مندانہ نہیں ہیں جو کہ معاشرے میں تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں اور ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہیں!!!

بچوں سے جنسی زیادتی

بچپن عمر کا سب سے خوب صورت دور ہے۔اس کو بے فکری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔معصومیت بچے کا اصل سرمایہ ہوتی ہے۔لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے بچوں کا جنسی استحصال کر کے ان سے بے فکری اور لاعلمی چھن لی جاتی ہے کوءجنسی درندہ اپنی وقتی تسکین کے لئے کسی بچے کو نشانہ بناتا ہے تو اس کے بعد کا ٹروما بچے کی ساری زندگی پہ اثر انداز ہوتا ہے۔دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی جنسی زیادتی کے واقعات میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہر سال ہزاروں بچے اس ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔اور سار زندگی اس نا کردہ گناہ کی سزا بھیجتے ہیں۔

بچوں کو ایسے خوف کا شکار کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان کھول نہیں پاتے اپنے ماں باپ تک کو نہیں بتاتے۔اور جو بتا دیتے ہیں ان کے ماں باپ معاشرے کے ڈر سے ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی پہ خاموش رہتے ہین۔زیادہ تر کیس رجسٹر نہیں ہو پاتے اور جو ہو جائیں ان پہ فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ان کیسوں میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے جن کی عمر نو سے گیارہ سال تک ہے۔انفرادی واقعات کے بعد اب تو اجتماعی واقعات نے بھی قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔قصور کا واقعہ جس میں ایک پورا گینگ پکڑا گیا جو کہ تقریباً چار سو بچوں پر جنسی تشدد کر کے ان کی ویڈیوز بناتا اور پھر ان کو بلیک میل کرتا تھا۔

پاکستان کی تقریباً چالیس فی صد آبادی پندرہ سال سے کم عمر افراد پہ مشتمل ہے آبادی کا یہ حصہ ہمارا مستقبل ہے سب سے گمبھیر مسئلہ بچوں کا جنسی استحصال ہے۔لیکن اس کو حل کرنے کی بجائے والدین اساتذہ اور حکومت مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔بچوں کو جنسی استحصال سے محفوظ رکھنے کے لئے بچوں اور والدین کا بہت ضروری ہے۔بچوں سے کھل کر بات کی جائے ان کو آگہی اور شعور دیا جائے تا کہ وہ گڈ اور بیڈ ٹچ میں فرق کر سکیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہنا چاہیے۔اس قسم کے ظلم سے بچوں میں جو نفسیاتی مسائل پیدا ہو تے ہیں۔جو عمر بھر پیچھا کرتے ہین بچے عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہونے لگتی

ہیں ڈر خوف عدم اعتماد اور تنہاء جیسی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں بچوں کا جنسی استحصال کوئی نیا مسئلہ نہیں لیکن آج کل جس تواتر سے اس قبیح فعل کی خبریں گردش میں آ رہی ہیں وہ لمحہ فکریہ ہے۔صحت مند معاشرہ کے فروغ کے لئے روشن پاکستان کی تکمیل کے لئے ایسے مسائل پہ توجہ دینا ہوگی۔

قبرستان

کراچی میں واقع گورا قبرستان مشہور و معروف ہے۔اس شہر میں ایک یہودیوں کا قبرستان بھی ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے گورا قبرستان آرٹ کے دلدادہ لوگوں کے لیے قابل دید مقام تھا۔ترتیب سے بنی قبریں، قبروں کے سرہانے لگے دیدہ زیب کتبے جن پہ صلیب کے نشان استادہ ہیں اوران پر سجے مریم بی بی کے مجسمے۔ جوں جوں وقت گزرا وہ پہلی سی آب وتاب تو نہ رہی تاہم پہلی نظر میں یہ غیر مسلموں کی آخری آرام گاہ دکھائی دیتی ہے۔چوروں نے مجسمے چوری کیئے کتبے بیچ ڈالے۔پھرزمانے کی سرد و گرم سہتے سہتے یہ مجسمے بھی کسی حد تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔یہودیوں کا قبرستان میوا شاہ قبرستان سے متصل ہے اوراس میں پانچ ہزار یہودی مدفون ہیں یہودیوں کی ثقافت قبروں کی بناوٹ اور تعمیر سے واضح ہے۔ان کی قبریں اپنا الگ طرز تعمیر رکھتی ہیں۔اس قبرستان میں تین سو سال پرانی قبریں بھی موجود ہیں۔

اب تیسری کمیونٹی مسلمانوں کی ہے جن کے مذہب میں پختہ قبروں کا تصورنہیں ہے۔لیکن بھیڑ چال میں تو مسلمان کا کوئی ثانی نہیں۔غیر مسلموں کی تقلید میں پہلے قبریں پکی ہوئی پھر کتبے سجے۔پھر سنگ مرمر کی ٹائلیں لگی مسلمانوں کی ثقافت اور تہذیب کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔قبریں ایسے سجائی گئیں گویا کہ تاج محل بنانے کا ارادہ تھا مگر

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اب دو حاضر کی روش کے مطابق سیلفیوں کا دور بھی چلتا ہے۔قبرستان عبرت کی جگہ ہے جائے تماشا نہیں۔یہ پیسہ جوان بے جان لوگوں کی قبروں پہ بہایا گیا زندوں پہ خرچ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔زندہ زندگی کے لیے ترسیں اور مردے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل گئیں۔ان کے لیے سنگ مرمر۔

1857 ادب اور غالب کے بعد

ہندوستان کی سیاسی صورت حال دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔جس کا نتیجہ 1857 کی جنگ آزادی کی صورت میں نکلا۔ باغیانہ سوچ دلی پر حملہ آور ہوئی۔آزادی کا خواب چند دیوانی آنکھوں کو بہت مہنگا پڑا۔11 مئی 1857 کی جنگ آزادی پھوٹ پڑی۔سارا دن گھڑ سواروں ، پیادوں اور گولیوں کی آوازوں سے شہر گونجنے لگا۔ہر طرف افراتفری مچ گئی۔دلی شہر بلی ماروں کا محلّہ چاندنی چوک سب لپیٹ میں آ گئے۔چار ماہ چار دن بعد فرنگی دوبارہ دلی پہ قابض ہو گئے۔بہادر شاہ ظفر بے قصور ہونے کے باوجود قید کر لئے گئے۔قلعہ میں فرنگیوں کا دفتر سج گیا۔سارا دن فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی۔گرفتاریاں عمل میں آتیں اور صبح سویرے گیا گھونسلوں کی طرح مسلمانوں کی لاشیں درختوں سے لٹکتی دکھاء دیتی۔میرزا کے کء دوست اور رشتہ دار نوادھر لیے گئے۔نواب شمس الدین خاں (والد داغ دہلوی) کو پہلے ہی "ولیم فریزز" کے قتل کے جرم میں کشمیری دروازے پہ پھانسی دی جا چکی تھی۔مرزا ک ذہنی معذور بھائی بھی "غدر" میں گولی کا نشانہ بن گئے۔اور دم توڑ گئے جیسے تیسے کر کے تدفین کی۔دلی کی رونقیں قصہ پارنیہ بن گئی۔ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی پڑ گئی۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے ،نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

بہت سے لوگ دلی سے ہجرت کر گئے جو بچ رہے دھر لیے گئے مرزا بھی ایک دن گرفتار کر کے قلعے میں پیش کر دیے گئے۔در و دیوار تو وہی تھے لیکن منظر بدل چکا تھا۔وہ قلعہ جہاں ابوظفر کا دربار سجتا تھا۔خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔مشاعرے ہوا کرتے تھے۔مرزا کو خطابات سے نوازا گیا تھا آج قطار میں لگے کھڑے تھے۔

انگریز افسر نے مرزا سے پوچھا! مسلمان ہو یا غیر مسلم۔مرزا بولے آدھا مسلمان آدھا غیر مسلم شراب پیتا

ہوں سور نہیں کھاتا۔اس لطیفے پر مرزا کی جان بخشی ہوگئی۔پھر میرزا کا زیادہ تر وقت خط و کتابت میں گزرنے لگا مرزا نے خطوط نگاری میں بھی جدت کو اپنایا۔اس وقت کے سیاسی حالات کا علم ان خطوط سے ہوتا ہے نیز جدید نثر کی بنیاد بھی یہ ہی خطوط بنے جن پر سرسید نے مضمون نگاری کی ابتدا کی۔مرزا کی حس مزاح کا بھی علم ہوتا ہے۔رنگون سے بہادر شاہ ظفر کی وفات کی خبر آ گئی۔اجڑی ہوئی دلی مزید اجڑ گئی۔

غدر کے بعد مرزا کا مغلیہ دربار سے جاری وظیفہ بند ہوگیا تو آپ نے والی رامپور نواب یوسف علی خان کو وظیفے کے لیے لکھا۔سو روپے ماہوار وظیفہ وفات تک ملتا رہا۔ بڑھاپے اور اکلاپے نے مرزا کو گھیر لیا۔ 15 فروری 1869 کو ایک ہفتہ کومہ میں رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔اردو ادب کا یہ باب بند ہونے کی بجائے نئی نئی جہتوں، نئے نئے مفہوم کے ساتھ پرت در پرت زمانے کے روبرو آ گیا۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

عورت

تعلیم یافتہ ممالک آزادی نسواں کا نعرہ لگاتے ہیں کہ مرعورت دونوں کو برابری کے حقوق دیے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواتین کو مرد حضرات کے برابر نہ سمجھا جائے۔ خواتین کو بھی مساویانہ حقوق ملنے چاہیے۔

جس قدر اسلام میں عورت کی قدر و منزلت کی گئی آج تک کسی اور معاشرے میں نہیں کی گئی۔ بنیادی مسلئہ آگہی نہیں ہے چونکہ اسلامی تعلیمات سے لاعلمی ہے اس لئے مسلمان عورت کو حجاب اور پردے کی وجہ مظلوم سمجھا جاتا ہے احکام ستر کو عورت پہ ظلم تصور کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

وہ یورپ جو آج حقوق نسواں کا علم بردار ہے وہاں چند سو سال قبل یہ حالات نہ تھے عورت کو انتہائی حقیر اور لایعقل سمجھا جاتا تھا انکے اس زمانے کے قوانین میں عورت شادی کے بعد کسی معاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی کوئی دستاویز جو اس نے خود لکھی ہو اپنی مرضی سے یا شوہر کی مرضی سے اس کی جواب دہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جو جائیداد عورت کو وراثت میں یا شادی سے قبل یا بعد میں ملی ہو اس پر اس کا شوہر قابض ہو جاتا اور عورت دعوی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شوہر کی بلا اجازت نہ تو کوئی اسباب خرید سکتی اور نہ کوئی چیز بیچ سکتی وہ روٹی، کپڑا مکان میں رہنے کے ضروریات زندگی پہ خرچ کے کوئی چیز بغیر شوہر کی پسند کے نہیں لے سکتی تھی۔

1870 میں برطانوی پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائیداد سے متعلق ایک بل پیش کیا گیا جس میں عورت کو بعد شادی جائیداد سے محرومی کے قانون کو منسوخ کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ مسٹر رسل گرے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون پیش کیا انہوں نے کہا قانون کی بموجب جو کچھ جائیداد عورت کے پاس شادی سے قبل ہوتی یا بیس میں شادی کے ملتی ہے جو کچھ وہ اپنی محنت سے کماتی ہے اس کے پاس نہیں رہتا۔ سب پر شوہر قابض ہو جاتا ہے۔ بس شادی کا اثر عورت پہ ایسے ہوتا ہے جیسا کوئی جرم قابل ضبطی جائیداد پہ ہوتا ہے۔ اس پہ ہاؤس آف کامنز کی اکثریت نے حمایت کی۔ اس وقت انگلستان کے قانون کا یہ حال تھا کہ کوئی قانون عورتوں کی بابت اس سے زیادہ ظالم اور نا انصاف نہ تھا۔ دوسری طرف اسلام قانون جو کہ تقریباً چودہ سو سال

قبل رائج ہوا۔اس میں عورتوں کو بے مثال عزت اور وقار دیا گیا۔اس کی رو سے نابالغ بچے بچیاں دونوں برابر ہیں دونوں پہ ماں باپ کے حقوق یکساں ہیں۔ ہمارے نبی حضرت محمد عربی نے بیٹیوں کو بیٹوں پہ ہمیشہ فوقیت دی۔اور انہیں اچھے سلوک کا زیادہ حق دار قرار دیا۔مرد کی طرح عورت کو بھی شادی کے معاملے میں حق راد ہی دی گئی

اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت کا بھی بلا رضا مندی نکاح نہیں ہوسکتا۔عورت اپنی ذاتی جائیداد کی خود مالک ومختار ہے۔اور اسُے تصرف کا بھی حق حاصل ہے۔وہ مرد کی طرح ہر قسم کے معاہدے کا اختیار بھی رکھتی ہے اسُ کی ذات ان معاہدوں دستاویزات اور جائیداد کی جواب دہ بھی ہے جو اسُ نے تحریر کیے۔جو جائیداد اُسے نکاح سے قبل ملی یا نکاح کے بعد اس جی ملکیت میں آئی اس کی مالک ہے۔وہ مثل مرد دعوی بھی کرسکتی ہے اور خود اس پہ بھی دعوی ہوسکتا ہے۔وہ اپنے مال و دولت کو خرچ کرسکتی ہے۔ہبہ کرسکتی ہے۔وصیت اور وقف بھی کرسکتی ہے۔وراثت سے جو حصہ اسلام نے اس کے لیے مختص کیا ہے ایک بٹا دو حصہ ہے۔یہاں مرد کو 1 حصہ اس لئیے دیا گیا کیونکہ معاشی تگ ودو کا ذمہ دار اسلام مرد کو بناتا ہے مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے لئے کما کر لا؟ عورت کو اسلام نے گھر کی چار دیواری میں ملکہ کی حیثیت دی جس کا فرض صرف بچوں کی پیدائش اور تعلیم وتربیت ہے۔شوہر کو نان نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

عورت ہر نیکی کماسکتی ہے۔جو ایک مرد کماسکتا ہے اس پہ برابر ثواب حاصل کرسکتی ہے اور گناہوں کے عوض مرد کی طرح سزا بھی پائے گی۔اسلام میں مرد کو عورت کے برابر سمجھا گیا۔کچھ شرعی معاملات میں عورت کو ایک درجہ کم حیثیت اس کی جذباتی فطرت کی وجہ سے دی گئی۔پردے کے احکامات عورت کے وقار کے لئے دیے گئے۔بے پردگی سے معاشرے میں اخلاقی بے راہ روی پھیلتی ہے جس کا خمیازہ پھر آنے والی نسلیں بھگتی ہیں اس کے اثرات دوُ ررس ہیں۔خلع کی صورت میں جو مال ومتاع عورت کو دیا جاتا ہے واپس نہ لینے کا حکم ہے بیوگی کی صورت میں ایک سال تک گھر سے نہ نکالے جانے کا حکم ہے۔مغرب میں عورت کو آج زیادہ حقوق حاصل ہیں۔کیونکہ وہاں قانون کی بالادستی ہے۔اسی لئے مغربی ممالک میں عورتوں کی حالت بہتر ہے اور اس کی وجہ قانون پہ عمل درآمد ہے آج جب پاکستان میں کوئی عورت خلع لینا چاہتی ہے تو اس کو عدالتوں کے چکر

کاٹنے پڑتے ہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑتا ہے دردر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اکثر تو بچوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔مغرب میں مرد کو گھر سے نکالا جاتا ہے بچے عورت کے حوالے کیے جاتے ہیں اور باپ کو بچوں کے اخراجات کا پابند بھی کیا جاتا ہے۔

اسلام کو جو نظامحضرت محمد عربی نے قائم کیا تھا اس میں عورت کے لئے تمام مراحل بے حد آسان تھے کئی امثال ہیں کہ خواتین کو خلع ،طلاق اور بیوگی کے بعد بھی تحفظ دینے کے واسطے عقد ثانی کر دیا گیا اسلام عورت کے تحفظ کے لئے عقد ثانی پہ بے حد زور دیتا ہے تا کہ معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار نہ ہو آج یورپ میں نکاح اور عقد ثانی پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے جنسی بے راہ روی عام ہے مرد کے لئے عورت کھلونا بن کر رہ گئی ہے یا شائید ایک ٹشو پیپر۔

عورت کو ترقی کے نام پر بے پردہ کر دیا گیا ہے۔معاشی دوڑ میں شانہ بہ شانہ۔آزادی کے نام پہ عورت نے درحقیقت زمہ داریوں کا طوق گلے میں ڈال لیا۔اسلام عورت کے ساتھ حسن سلوک ،محبت اور خاطر داری کا حکم دیتا ہے۔عورتوں کو خدمت گزار سمجھنے کا تصور ہندوآنہ ہے اسلامی نہیں۔ ہندو معاشرے میں ایک عورت بیاہ کر جب سسرال میں قدم رکھتی ہے تو سب کی باندی بنادی جاتی ہے جبکہ اسلام نکاح کے بعد عورت کو الگ گھر دیتا ہے۔مشترکہ خاندانی نظام اسلام کی سوچ نہیں۔ ہندوستان میں عورت کے معاملے میں ایسی خاک اڑ رہی ہے کہ مظالم کا تصور ہی روح فرسا ہے۔

عورت پہ جو ظلم آج پاکستان میں ہو رہا ہے اس کی وجہ احکام اسلام پہ عمل نہ کرنا ہے بلکہ شعور کی کمی ہے آگہی کا فقدان ہے۔مغرب نے آہستہ آہستہ خواتین کی حالت کو سدھارا ہے ان کا قانون آج عورت کے معاملے میں دنیا میں رائج سب قوانین سے بہتر ہے۔اور پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔آج ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے اعمال کو درست کر کے مذہب اسلام کے نور سے عالم کو منور کریں تا کہ آزادی نسواں کا اصل تصور سامنے آسکے۔

دجال

زمین اپنی پیداوار ایک تہائی کم کر دے گی۔آسمان سے بارشوں کا سلسلہ کم ہو جائے گا چنانچہ زمین کی گلہ اگلنے کی صلاحیت کم ہو جائے گی۔ایک سال گزرے گا اور زمین اپنی پیداوار مزید ایک تہائی کم کر دے گی۔آسمان س بارشیں مزید کم برسیں گی۔تیسرے سال اسی صورتحال سے دنیا میں شدید قحط آجائے گا۔اور ہر طرف پانی اور اجناس کی طلب بڑھ جائے گی۔یہ دجال کی آمد کا اعلان ہوگا۔ایسے حالات میں دجال دنیا میں نمودار ہوگا۔دجال ایک شخص کا نام نہیں۔دنیا کے نظام پہ ایک سوچ ،ایک عذاب اور ایک بہت بڑی آزمائش کا نام ہے۔

اللہ تعالی نے دنیا کی تکمیل کے بعد بنی نوع انسان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا بلکہ اپنی خاص رحمت ہم انسانوں پہ کی۔اور اپنے چنیدہ نیک بندوں یعنی رسولوں کے ذریعے سے مسلسل ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔جس قوم نے اطاعت کی وہ کامیاب ہوئی۔اور جنہوں نے خواہش نفس کی پیروی کی۔عذاب کا شکار ہوئی۔دجال کے خروج سے قبل اس کے لیے راہ ہموار کرنے کا سلسلہ یہود و نصاری کی کوششوں سے جاری ہے۔خفیہ اسرائیلی سازشیں تو عرصہ سے جاری ہیں۔اس کی ظاہری مثال یروشلم میں امریکی سفارت خانہ کے قیام کے اعلان سے دیکھی جاسکتی ہے۔دجال کو اللہ بہت زیادہ قوت عطا فرمائیں گے۔یہ دنیا کے تمام وسائل پہ اس وقت قابض ہوگا جب دنیا شدید قحط کی لپیٹ میں ہوگی۔اور یہ ساری دنیا کے ارد گرد اپنی جدید سواری میں چکر لگائے گا۔دجال دنیا پر چالیس دن قیام کرے گا۔پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا۔دوسرا دن ایک ماہ کے برابر اور تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا باقی دن عام دنوں کی مثل ہونگے۔

اس کی ایک آنکھ ہوگی۔پیشانی پہ ک۔ف۔ر ''کفر'' یا'' کافر'' لکھا ہوگا جسے ایمان والا پڑھ سکے گا۔آج

دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔سیٹلائیٹ اور نیٹ کے ذریعے سب ممالک اور اقوام جُڑ چکے ہیں۔اقبال فرماتے ہیں کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے

ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق دجال کے ہاتھ میں اللہ ایسی قوت دیں گے کہ اس کے حکم پہ آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار حاصل ہوگی۔زمین اپنےخفیہ خزانے اگلے گی۔اس کے پیچھے خزانے اور لوگ ایسے چلیں گے جیسے شہد کی مکھیاں ملکہ مکھی کے پیچھے چلتی ہیں۔جیسے لوہا مقناطس کی طرف کھنچا آتا ہے۔اسکے حکم پر جانور صحت مندہ جایئں گے بیمار تندرست۔یہ کہے گا کہ مجھے رب مانو۔پھر اپنے دو کارندے شیطانوں کو حکم دے گا کہ اس شخص جس سے یہ اسوقت ہم کلام ہو گا کہ والدین کی شکل اختیار کرلو۔اب اس آدمی سے کہے گا مجھے رب مانو میں تمھارے مردہ والدین کو زندہ کرسکتا ہوں اور اپنے شیطانی شعبدے کے ذریعے نقلی والدین پیش کردے گا۔کمزور ایما والے اس کی باتوں میں آجائیں گے۔جب کہ پختہ ایمان والا کہے گا تو کانا دجال ہے۔جس پہ یہ اس کو آرے سے چِیر دے گا۔یہ آدمی کو قتل کے بعد دوبارہ زندہ کردے گا۔اور کہے گا کہ میں ترا رب ہوں۔یہ سب دجال کے ذاتی کمال سے نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالی اس کی رسی دراز کریں گے اور انسانوں کی آزمائش کے لیے اسکو قوت دی جائے گی کہ دیکھا جائے کہ کون حق کی پیروی کرتا ہے اور کون باطل کی۔اس کے پاس بہت سے حربے ہونگے بہت شعبدے ہونگے اور وسائل پہ اسکا قبضہ ہوگا یہ دنیا پہ قیامت سے پہلے ایک قیامت برپا کردے گا۔امام مہدی کا نزول ہوگا۔وہ اپنے جانبازوں کو لے کر لڑنے کی تیاری کررہے ہونگے کہ حضرت عیسی کا نزول ہوگا۔

حضرت عیسی دجال کو ’’باب لُد‘‘ کے مقام پہ قتل کرینگے اس وقت دجال کے ساتھ ستر ہزار یہودیوں کی جماعت ہوگی۔یہ یہودی لڑائی کے دوران ’’غرقد‘‘ نامی درخت میں پناہ لیں گے۔اور یہ درخت یہودی کو اپنے اندر چھپالے گا۔اللہ کی مدد سے فتح ہوگی۔’’فتنہ دجال‘‘ بعثتِ آدم سے قیامت تک کی سب سے بڑی اور

ہولناک آزمائش ہے۔اس سے حضرت محمدﷺ نے پناہ مانگی اورامت کومحفوظ رہنے کے لیے سورۃ کہف کہ پہلی دس آیات حفظ کرنے کی تلقین فرمائی۔اللہ مجھے آپ سب کو اور ہماری آنے والی نسلوں کواس سے محفوظ رکھے۔آمین۔

میرا پیغمبر

مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمالِ خلاق ذات اُس کی
جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ شرحِ احکام حق تعالیٰ
وہ خود ہی قانون خود حوالہ
وہ خود ہی قرآن خود ہی قاری
وہ آپ مہتاب آپ ہالہ
وہ عکس بھی اور آئینہ بھی
وہ نقطہ بھی خط بھی دائرہ بھی
وہ خود نظارہ ہے خود نظر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے
شعور لایا کتاب لایا
وہ حشر تک کا نصاب لایا
دیا بھی کامل نظام اس نے

اور آپ ہی انقلاب لایا

وہ علم کی اور عمل کی حد بھی

ازل بھی اس کا ہے اور ابد بھی

وہ ہر زمانے کا راہبر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ آدم و نوح سے زیادہ

بلند ہمت بلند ارادہ

وہ زُہدِ عیسیٰ سے کوسوں آگے

جو سب کی منزل وہ اس کا جادہ

ہر اک پیمبر نہاں ہے اس میں

ہجومِ پیغمبراں ہے اس میں

وہ جس طرف ہے خدا ادھر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے

بس ایک مشکیزہ اک چٹائی

ذرا سے جَو ایک چارپائی

بدن پہ کپڑے بھی واجبی سے

نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی

یہی ہے کُل کائنات جس کی

گنی نہ جاء?ں صفات جس کی

وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے
جو اپنا دامن لہو سے بھر لے
مصیبتیں اپنی جان پر لے
جو تیغ زن سے لڑے نہتا
جو غالب آ کر بھی صلح کر لے
اسیر دشمن کی چاہ میں بھی
مخالفوں کی نگاہ میں بھی
امیں ہے صادق ہے معتبر ہے
میرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ خلوتوں میں بھی صف بہ صف بھی
وہ اِس طرف بھی وہ اُس طرف بھی
محاذ و منبر ٹھکانے اس کے
وہ سر بسجدہ بھی سر بکف بھی
کہیں وہ موتی کہیں ستارہ
وہ جامعیت کا استعارہ
وہ صبحِ تہذیب کا گجر ہے
میرا پیمبر عظیم تر ہے
(مظفر وارثی)

جسے شاہِ شش جہات دیکھوں

اُسے غریبوں کے ساتھ دیکھوں

عنانِ کون ومکاں جو تھامے

کدال پر بھی وہ ہاتھ دیکھوں

لگے جو مزدور شاہ ایسا

نذر نہ دَھن سربراہ ایسا

فلک نشیں کا زمیں پہ گھر ہے

میرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ سعید ساعت جس کے انتظار میں کائنات نے ان گنت برس انتظار کیا۔جس کے شوق میں ماہ و خورشید ازل سے چشم براہ تھے۔وہ عظیم ہستی جس کے پاؤں چومنے کے لیے زمیں کا ذرہ ذرہ بے تاب تھا ۔جس دن اس ہادی برحق کی ولادت ہوئی۔اس دن وادی مکہ کی ہواؤں میں عجب کیف و مستی تھی۔وادی مکہ پُر بہار تھی۔یہ ۹/۲۱ ربیع الاول کی صبح جاں فزا تھی۔حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ جب میں نے نور مجسم کو جنم دیا تو ایک عظیم نور دیکھا جو برابر پھیلتا چلا گیا۔

وادیِ مکہ کا بوڑھا سردار عبدالمطلب کعبۃ اللہ کے طواف میں محو تھا اس پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی کہ اچانک مرحوم بیٹے عبداللہ کی کنیز'' برکہ'' نمودار ہوتی ہے گلنار چہرے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دادے کو پوتے کی پیدائش کی خوش خبری سناتی ہے۔بوڑھا سردار بے اختیار کعبہ کا غلاف تھام لیتا ہے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے۔گھر تشریف لا کر نومولود کے پاکیزہ اور معطر بدن کو گود میں لے لیتا ہے بچے کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے پھر بچے سمیت حرم کعبہ واپس آ کر دیر تک دعائیں کرتا رہتا ہے۔دادا نے نام'' محمد'' رکھا والدہ نے'' احمد'' رکھا۔یہ مبارک وجود جہاں جہاں پرورش پاتا رہا اپنی خیر و برکات سے خوشحالی اور طمانیت کی فضا پھیلاتا رہا۔رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کے گھر میں حضرت محمد کی آمد کے ساتھ ہی رزق کی فراوانی ہوگئی۔آپ کی نشو ونما عام بچوں سے کہیں زیادہ تیزی سے سرعت پذیر ہوئی۔چھ سال کی عمر میں شق الصدر کا واقعہ پیش آیا

۔والدہ اور دادا یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ۔حضرت محمد چچا ابو طالب کے گھر رہنے لگے ۔چچا کی مالی حالت جو کہ کمزور تھی آپ کی برکت سے سنورنے لگی ۔راہب بحیرہ اور راہب نسطورا نے سفرِشام میں آپ کی نبوت کی نشان دہی کی اور یہودیوں سے حفاظت کا مشورہ دیا۔تجارت کا پیشہ اختیار کیا شیوہ پیغمبری کے طور پر گلہ بانی بھی کی ۔ہادیِ برحق ، نبی آخرالزماں کی رسالت کے آغاز سے قبل خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونا شروع ہو گئے ۔غارحرا کی تاریکی میں آپ سر بسجود ہیں کہ دفعتاً غار نور سے بھر جاتا ہے آپ چونک اٹھتے ہیں دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک فرشتہ موجود ہے جو کہ آپ کو نبوت کی بشارت دیتا ہے۔سورہ علق کی آیات وحی کی جاتی ہیں۔جلال بے پایاں کے جلوے کی چکا چوند اٹھانے کا پہلا موقع تھا۔آپ بے چین ہو گئے ۔حیرت اور ہیبت زدہ ہو گئے_ حضرت خدیجہ نے ڈھارس بندھائی آپ کے صادق اور امین ہونے کا جواز دیا آپ کے حلیم لطبع ہونے کا عذر پیش کیا۔حضرت علی،حضرت ابوبکر حضرت زید بن حارثہ تینوں بلا توقف دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ۔دعوت اسلام کا خفیہ دور شروع ہو گیا۔آہستہ آہستہ دائرہ اسلام میں آنے والوں کی تعداد چالیس ہو گئی۔تین برس تک نہایت رازداری کے ساتھ تبلیغ کا فریضہ جاری رہا۔پھر حضرت عمر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تو کوہِ صفا پر کفار مکہ کو علی اعلان دعوت دینے کا وقت آ پہنچا آپ نے توحید کی دعوت دی جس پر مجمع سیخ پا ہو گیا۔

اب کفار کی طرف سے کھل کر مخالفت اور ایذا رسانی ،ظلم وستم کا آغاز ہو گیا کہ ہجرت حبشہ اختیار کی گئی۔عبدالمطلب اور حضرت خدیجہ داغ مفارقت دے گئے ۔حضرت محمد پر صدمات سے نڈھال عام الحزن کا پُر ملال سال گزرا۔مکہ والوں کی زیادتیاں بڑھتی گئیں حضرت محمد نے اپنے غلام زید بن حارثہ کے ساتھ تبلیغ کے لیے سفرِ طائف اختیار کیا۔اہلِ طائف نے زخموں سے چور چور کر دیا۔دردناک سفر کے بعد سفرِ معراج جیسی عظمت سے رب نے نوازا۔کون ومکاں کی سب وسعتیں سمٹ گئیں ساتوں آسماں کی سیر کے بعد سدرہ المنتہی تک گئے ۔اللہ تعالی سے روبرو ہوئے ۔خلوت گاہِ راز میں راز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوا جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

حضرت محمد نے صحابہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی ۔مواخات مدینہ ہوئی ۔ مسجد نبوی کی تعمیر عمل میں آئی ۔اذان کی ابتدا ہوئی ۔ میثاق مدینہ عمل میں آیا۔غزوات کا آغاز ہوا۔غزوہ بدر،غزوہ احد،غزوہ بنونضیر،غزوہ خندق اور صلح حدیبیہ وقوع پذیر ہوئی ۔مسلمانوں نے فتح خیبر،معرکہ موتہ میں بہادری کے جھنڈے گاڑھے ۔فتح مکہ ہوئی ۔حق آ پہنچا اور باطل مٹ گیا۔حضرت بلال نے کعبہ میں اذان دی ۔لطف وکرم،رحم وعطا،عفو اور درگزر کی نئی مثال قائم ہوئی عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔غزوہ حنین میں فتح ملی ۔عام الوفود سے حق کا اجالا پھیلتا گیا اور ظلمتیں کافور ہوتی چلی گئی ۔غزوہ تبوک کی تیاری کی گئی حضرت محمد نے ایک ماہ تبوک میں قیام فرمایا لیکن جنگ پیش نہ آئی ۔اہل شام نے حملے کا خیال ترک کر دیا۔دس ہجری کو حضرت محمد نے حج کا ارادہ فرمایا ۔یہ آپ کا پہلا اور آخری حج تھا صحابہ کے ساتھ مناسکِ حج ادا کیے ۔خطبہ حجتہ الوداع دیا۔روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت ہے جب تک تکمیل شریعت اور تذکیہِ نفوس کا عظیم الشان کام درجہ کمال تک پہنچ جائے ۔حجتہ الوداع میں یہ اہم کام سرانجام ہو چکا۔مکہ واپسی کے کچھ عرصے بعد مرض الموت کا آغاز ہو گیا حضرت محمد کا سر درد بخار میں بدل گیا حتیٰ کہ آپ کے بدن مبارک میں مسجد تک آمد کی قوت بھی نہ رہی حضرت محمد نے حضرت ابوبکر کو نماز کی امامت سونپی ۔حضرت محمد کی وفات کا وقت قریب آ رہا تھا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری کا دن تھا حضرت عائشہ کی آغوش میں مبارک سر تھا انگشت شہادت سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور تین بار یہ الفاظ دہرائے **" اللھم الرفیق اعلی "**

یہ کہتے ہوئے روح پاک جسم مبارک سے پرواز کر گئی اس وقت آپ کی عمر مبارک تریسٹھ برس چار دن تھی آپ کو حضرت عائشہ کے حجرے میں دفن کر دیا گیا۔وصیت کے مطابق غسل دیا گیا فرشتوں نے نماز جنازہ ادا کی پھر باری باری دس دس صحابہ کی جماعت کی طرف سے حجرہ شریف میں فرداً فرداً نماز جنازہ ادا کی گئی۔

دین کی تبلیغ کا فریضہ آپ نیعمد گی سے ادا کیا اللہ کے رستے میں سب سے زیادہ ستائے گئے آپ کے اہل بیت نے ازواج مطہرات نے اس مشن میں آپ کا بھرپور ساتھ دیا آپ کی گیارہ ازواج مطہرات تھیں

حضرت خدیجہ جن کے بطن سے دو بیٹے حضرت قاسم حضرت عبداللہ چار بیٹیاں سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمہ تولد ہوئے۔ دیگر ازواج میں حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفظہ، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام سلمی، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت صفیہ، حضرت میمونہ تھیں۔ ان دس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ایک بیٹا ماریہ قبطیہ کے بدن سے ہوا یہ بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔

آپ پیغمبر رحمت تھے۔ تمام عالم کے لیے سراپا رحمت تھیآپ کی پاکیزہ سیرت امت مسلمہ کے لیے عظیم نعمت ہے آپ کی سنت مبارکہ وہ روشنی ہے جس سے زندگی کے سب گوشے منور ہو سکتے ہیں امت مسلمہ کی بھلائی اتباع رسول میں ہے سیرت طیبہ کا مطالعہ، اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے مطابق زندگی گزرانے کی کوشش کرنا ہر بندہ مومن پر واجب ہے۔ اللہ تعالی کی نعمت کبری مسلمانوں سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک سیرت رسول کو حرزِ جاں بنا کر رکھیں اسے بار بار پڑھیں اور زندگی کے ہر گام پر اس سے روشنی حاصل کرتے رہیں۔

عالمی دن

زمانے کی ترقی نے نت نئے رواجوں کو جنم دیا ہے۔ مغرب کے عجیب و غریب چونچلے مشرق میں بلا سوچے سمجھے اپنائے جاتے ہیں۔ اسی غلامانہ ذہنیت نے برصغیر کے عوام کو دو سو سال تک انگیزوں کا غلام بنائے رکھا اور گزشتہ ستر سال سے سیاسی شعبدہ بازوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ مغرب سے درآمد شدہ طریقوں میں سالگرہ منانے کا رواج کیا کم تھا کہ عالمی دن منانے کی وبا بھی عام ہوگئی ہے۔ سوشل میڈیا کی توسط سے آئے دن کسی نہ کسی چیز کے عالمی دن کا علم ہوتا رہتا ہے۔ ان عالمی دنوں میں شامل ہیں ماں، باپ، استادوں کھیلوں، خوراک، نرسوں، آبادی، اونٹوں بیماریوں، درختوں، بیواؤں وغیرہ وغیرہ اور بے شمار اقسام کے عالمی دن۔

درحقیقت یہ ایک سلسلہ ہے جس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اگر یہ آگہی کے لیے ہے تو پاکستانی عوام تو اپنے بنیادی حقوق سے آگاہ نہیں ہے۔ جو افراد آگاہ ہیں وہ بھی آواز نہیں اٹھاتے۔ اگر یہ عالمی دن محض بھیڑ چال ہیں تو معاشرہ انہیں مناتے مناتے مزید بے حس ہو جائے گا۔ ان عالمی دنوں کی بجائے عملی اقدامات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قانون سازی اور پھر قانون پر عمل درآمد سے معاشرے میں سدھار پیدا ہو گا نہ کے سوشل میڈیا پر ایموجی اسٹکر کمنٹ کرنے سے۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے سب مسائل کا حل صرف اور صرف خواندگی ہے۔ عالمی دن منانے، بینرز لہرانے اور واک کرنے سے یہ مسائل حل نہیں ہونگے۔ دنیا کے گلوبل ویلج بن جانے سے پاکستان کے سماجی مسائل تو حل نہیں ہو رہے اور نہ ہی معاشرے میں بہتری آ رہی ہے البتہ نوجوں نسل اپنی تہذیب وتمدن سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

پردہ

انسان کی طبعیت کو خدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں ،کبھی تو بدی حاوی ہو جاتی ہے اور کبھی نیکی۔ معاشرے کی درستگی کے لیے قرینہ ہے کہ نیکی ہمیشہ بدی پہ غالب رہے تا کہ انسانی معاشرہ حیوانیت سے محفوظ رہ سکے۔ جب کرہ ارض گناہوں کے بوجھ سے تھرتھرانے لگتی ہے تو اللہ تعالی ایک نبی یا رسول مبعوث فرماتے رہے ہیں تا کہ زندگی اپنے اصل ڈھب پر آسکے اور جس مقصد کے لیے آفرینش آدم کی گئی ، وہ مکمل ہو سکے۔ دین اسلام کا آغاز آج سے تقریبا چودہ سو سال قبل ہوا جب ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں اللہ تعالی کا آخری پیغام لے کر تشریف لائے۔ بنی نوع انسانیت جہالت کی جن تاریکیوں میں غوطہ زن تھی اس تاریکی میں عورت بھی ایک حقیر ترین شے تھی۔ اس کا مقام زرخرید غلام کا سا تھا۔عورت کو ہر حق سے محروم رکھا جاتا۔ بچیوں کو زندہ گاڑ دیا جاتا غرض یہ کہ ہر سطح پہ عورت کا استحصال کیا جاتا۔

اسلام کی روشنی جیسے جیسے پھیلتی گئی ، احکامات الہی کا نزول وحی کی شکل میں اس معاشرے کی تشکیل کے مطابق ہوتا گیا۔ جہاں مرد وزن کو ہر معاملے میں یکساں احکامات دیے گئے وہاں خواتین کو پردے کو ہدایت کی گئی۔ پردہ اصلا معاشرے کی فلاح کی طرف ایک قدم ہے، بظاہر یہ خواتین کے لیے ایک مشکل امر نظر آتا ہے، ایک پابندی جیسا ،لیکن اگر اس کے نتائج دیکھے جائیں تو معاشرے کا سکون اور عورت کا اصل تحفظ پردے میں ہے۔

آج مغرب کے افکار اس قدر اثر انداز ہو چکے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کی طرح عورتیں سج دھج کر گھر سے فخریہ طور پر نکلتی ہیں، ایک طبقے کی طرف سے پردے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اسے عورت پہ بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالی کا کوئی بھی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہے، بیپردگی کے تباہ کن اثرات معاشرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں، بیراہ روی بڑھ جاتی ہے، گھر اجڑ جاتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی مثال ہمارے سامنے

ہے۔اسلام اپنے پیروکاروں کو ایک صحت مند معاشرہ دینا چاہتا ہے جہاں عورت ایک مقدس چیز ہے، مرد کا کھلونا نہیں۔عورت شمع خانہ ہے شمع محفل نہیں۔

بظاہر تو یہ ایک عورت کا ذاتی مسلئہ نظر آتا ہے کہ وہ حجاب لیتی ہے یا نہیں لیکن اس کے اثرات بلاواسطہ طور پر سارے معاشرے پہ پڑتے ہیں۔شرم وحیا عورت کا زیور ہے جس سے ایک سازش کے تحت عورت کو دور کیا جا رہا ہے۔دین سے دوری بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہے۔ایک اور اہم وجہ مستعار لیا ہوا تعلیمی نصاب بھی ہے جو کہ نئی نسل کو اسلام کی بنیادی اقدار سے دور کر رہا ہے۔

دین اسلام کا آئیڈیل معاشرہ جو کہ ہمارے نبی ? نے ہمیں قائم کر کے دکھایا، ویسا معاشرہ قائم کرنا ہمارے پہلی اور آخری ترجیح ہونی چاہیے،جس میں حیا کا چلن ہو اور عورت محترم اور محفوظ ہو۔معاشرے کی اصلاح کے لیے خواتین کی تربیت بھی ضروری ہے جو کہ آنے والی نسل کی امین ہے۔خواتین کو اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے ذریعے اسلام کا شعور دینا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی نسلوں کی بہتر تربیت کرسکیں۔اسلامی وضع قطع ایک غیر مسلم اور مسلمان عورت کا فرق ہے۔ہر انسان کا عمل اس کے عقیدے کا مظہر ہے۔شخصی آزادی کا نعرہ عورت کے حوالے کر کے اس کو گمراہ کرنا مغرب کا بنیادی مقصد ہے۔اس گمراہی کی دلدل سے نئی نسل کو نکالنا ماؤں کا فرض ہے۔میرا، آپ کا، ہم سب کا۔

تیسری جنگ

بنی سرائیل اللہ تعالی کی سرکش قوم تھی۔انبیاء کے ناحق قتل اور احکامات سیر وگردانی کی وجہ سے ذلت اور مسکنیت ان پر غالب کر دی گئی۔اور یہ در بدر ہوگئے۔مارے مارے پھرنے کے بعد جب حضرت عیسی کا نزول ہوا۔اورانہیں پیغمبر آخرالزماں کی آمد کی خبر ہوئی تو یہ لوگ مکہ میں آباد ہونے لگ گئے۔ان کا خیال تھا کہ نجات دہندہ ان میں سے آئیں گے۔

حضرت محمدکواللہ تعالی نے بنی اسماعیل میں پیدا فرمایا۔یہ دیکھ کر یہ یہودی بپھر گئے اور دشمنی کا راستہ اختیار کیا۔حضرت عمر کے دور خلافت میں یروشلم فتح ہوا۔اور یہودی اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیئے عیسائیوں سے گٹھ جوڑ کرنے لگے۔چنانچہ مسمانوں پہ صلیبی جنگیں مسلط کر دی گئیں۔اور مقدس سرزمین لہو سے رنگین کر دی گئی۔وقت گزرنے ے ساتھ ساتھ مسلمان بے عملی کا شکار ہوتے گئے۔یورو اور ڈالر کے سودی نظام نے معاشی میدان مس کمر توڑی۔اسلام سے دوری نے کردار میں اخلاقی قدروں کی تنزلی کی۔زوال پذیر قوم پسماندگی کا شکار ہوتی گئی۔اللہ تعالی اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے لیکن ظلم کا قانون اور اس پر قائم معاشرہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔اور پھر اللہ تعالی کی سزا کا سلسلہ شروع ہو جا تا ہے۔آج مسلمانوں کی کمزوری نے امریکہ اور اسرائیل کے اتحاد کو تقویت دی ہے۔آج کا مسلمان عمل کی بجائے نعرے کو اسلام سمجھ بیٹھا ہے۔نعرے لگائے ،احتجاج کیا،آواز بلند کی اور پھر خاموشی۔یہ اسلام کی تعلیمات نہیں ہیں۔یہ وہ مذہب ہے جو اخلاق اور کردار سے پھیلا۔صیہونی قوتوں کے مقابلے کے لیے اسوہ حسنہ کی پیروی لازم ہے۔پھر اللہ کی مدد شامل ہوتی ہے۔

مٹھی بھر مسلمان اقوامِ عالم پر اسی کردار کی بلندی کی وجہ سے چھائے تھے۔۔وہ تیسری عالمی جنگ جس کا آغاز ہونے والا ہے اسکی تیاری اور چال اسرائیل اس صدی کے آغاز سے کر رہا ہے۔اللہ تعالی کی تدبیر انشا اللہ

کفار کی چالوں پہ غالب ہوگی ."واللہ خیر المکرین "

ٹرمپ کے سفارت خانے کے قیام کے اقدام سے امن کو خطرہ تولاحق ہوا ہے۔لیکن یہ دنیا کے اختتام کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔دجال کی آمد کی تیاری ہے۔اور مسلمان ہونے کی حثیت سے ہمارے لیے بھی خطرہ کی گھنٹی ہے کہ قیامت قریب ہے۔ہرانسان کی موت اسکے لیے قیامتِ صغری ہے۔اوراسکی تیاری ہمارے لیے ہر فتنہ اور قیامت سے امن میں رہنے کی تدبیر ہے۔آیئے آخرت کی تیاری کریں۔ربنا تقبل منا.

زینب اغوا، ریپ، قتل کیس! ذمہ دار کون!

آج پاکستان کے شہر قصور کی تاریخی اہمیت بچوں کے ساتھ مظالم اور بدنامی کے پردے میں چھپ کر رہ گئی ہے۔اب یہ شہر کم سن بچوں کے حوالے سے خطرناک ترین حوالہ بن چکا ہے۔وہ کون سی وجوہات ہیں جوان واقعات کی بنیاد بن رہی ہیں؟ ہر واقعہ محرکات سے جنم لیتا ہے۔۔اس کا پس منظر کئی چھوٹی بڑی وجوہات سے جڑا ہوتا ہے۔کوئی واقعہ یک دم رونما نہیں ہوتا۔کوئی حادثہ لاپروائی کے بغیر انجام نہیں پاتا۔

انسان کی تخلیق شرف انسانیت کے لئے کی گئی۔لیکن یہ انسان جب گرنے پہ آتا ہے تو حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی بھی ایک ایسا ہی المیہ ہے جو کہ دنیا بھر میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔مغربی ممالک میں اس کی شرح مشرقی ممالک سے زیادہ ہے لیکن قابل افسوس یہ امر ہے کہ اس نوعیت کے واقعات جب پاکستان جیسے ملک میں ہو جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تو یہ ایک بدنما داغ بن جاتے ہیں اور ساری دنیا میں پاکستان کا امیج مزید خراب کرتے ہیں۔چونکہ اسلامی نظام ستر سال گزرنے کے باوجود بھی نافذ نہ ہوسکا۔اس لیئے ایسے مجرم دندناتے پھرتے ہیں۔اگر ایسے مجرموں کو سرعام پھانسی دی جائے تو یہ زیادتی کے کیس بھی ختم ہو جائیں۔لیکن اوّل تو پولیس ان مجرموں کو پکڑتی ہی نہیں اور اگر پکڑ بھی لے تو سزا سے بچ جاتے ہیں۔آج کل پاکستان میں ''زینب قتل کیس'' سرخیوں کی زینت ہے۔''زینب'' جیسی بے شمار بچیاں اور بچے اس سے قبل بھی زیادتی کا شکار اور پھر قتل ہوا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے سوال یہ ہے!

زیادتی کا شکار ہونے والے بچے اور بچیوں کی تعداد پانچ سے پندرہ سال کے درمیان ہوتی ہے۔کسی جنونی نفسیاتی انسان کا آسان ہدف کم عمر بچے ہیں۔کوئی انسان ایسی قبیح حرکت کیوں کرتا ہے؟اس کی وجوہات

میں سب سے پہلی وجہ وقتی تسکین ہے۔ دوسری اہم وجہ سوچ کی غلط سمت ہے۔ چونکہ پاکستان میں مذہبی اقدار رائج ہیں۔ یہاں بوا؟ فریڈ/گرل فرینڈ کا کلچر مڈل کلاس کے لیول پر ناپسندیدہ ہے اس لیئے ہیجان خیز تجربے سے لطف اندوزی کے لیے کم عمر لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ بہت ساری بچیاں طویل عرصے تک ان جنسی درندوں کی ہوسِ کا نشانہ بنتی رہتی ہیں اور ڈر کے مارے زبان بند رکھتی ہیں۔ زیادہ تر کو اغوا کیا جاتا ہے اور پہچان لیئے جانے کے خوف سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اپر کلاس میں معاملہ مختلف ہے۔ گھر میں رکھے ہو؟ ملازم خانساماں، ڈرائیور، مالی وغیرہ بچے بچیوں کو جنسی زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں۔ کبھی کبھی قتل تک نوبت بھی پہنچ جاتی ہے۔

نچلے طبقے میں اخلاقی اقدار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جہالت عام ہے، روٹی ان کا مسل؟ ہے لہذا ایسے لوگ یعنی گھریلو ملازم، خانہ بدوش اور فقیر وغیرہ اس قسم کی حرکات میں بچپن میں ہی ملوث ہو جاتے ہیں اور ان کی اکثریت " سیکس ورکر " کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ اس طبقے سے تو کوئی امید ہی فضول ہے۔

امیر طبقے کے والدین کے پاس بچوں کے لیے وقت نہیں ہے وہ بچوں کو توجہ نہیں دے پاتے لہذا یہ توجہ جب کسی تھرڈ پرسن سے ملتی ہے اور اسکا آغاز دوستی سے ہوتا ہے جو بعد میں جنسی زیادتی جیسے مکروہ فعل میں بدل جاتی ہے تو یہ بچے اس دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

مڈل کلاس طبقہ جس کا حصہ ''زینب'' نامی بچی تھی۔ اس طبقے میں اغوا اور پھر قتل کی شرح زیادہ ہے۔ ماں باپ معاشی جدوجہد میں پھنسے ہو؟ ہیں۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ باپ سارا دن گھر سے باہر روزگار کے سلسلے میں مصروف رہتا ہے تو خاتون خانہ کے پاس بچیوں کی تربیت کے لیے وقت نہیں ہے۔ بچیوں کے گھر سے باہر آنے جانے کی صورت میں ایسے جنسی درندے تاک میں رہتے ہیں۔ اور دوستی کا اختتام قتل پہ ہوتا ہے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے اور بچیوں کو گھر سے باہر تنہا مت بھجیں۔

بچوں کو ''گڈ'' اور ''بیڈ'' ٹچ میں فرق بتایا جائے۔ کسی آشنا کسے اجنبی سے کوئی چیز لے کے مت کھائی جا؟۔ کسی کے ساتھ کہیں مت جایا جائے۔ زینب ریپ اور مرڈر کیس ہی کو لیجئے۔ اس واقعے کا ذمہ دار کون ہے۔ وہ ماں باپ جو اپنی پہلی ذمہ داری بچوں کی حفاظت کو نظر انداز کر کے نفلی عبادت ''عمرہ'' کی ادائیگی کے لیئے چلے گئے۔ زینب کی پھوپھو جس کے حوالے وہ اپنے چاروں بچے کر کے گئے تھے۔ ''زینب'' کی بڑی دو

بہنیں اور ایک بھائی جو اپنی چھوٹی بہن کا خیال نہیں رکھ پائے۔ کہ وہ کیا کر رہی ہے! کس سے رابطے میں ہے؟ کون اس کو خود سے مانوس کر رہا ہے؟ یا پورن فلمیں دیکھنے والا پاکستانی معاشرے کا اخلاق باختہ نوجوان جو کہ اغوا، زیادتی، تشدد اور پھر قتل جیسے بہیمانہ فعل کو کر گزرا۔

ماضی میں بھی ایسے واقعات ہوتے تھے۔ سکولوں، مدرسوں، محلوں اور رشتے داروں میں بچے جنسی زیادتی کا نشانہ بنتے تھے لیکن اغوا اور قتل کی شرح بہت کم تھی۔ آج اس شرح کے بڑھنے کا سبب نیٹ پر موجود ''پورون'' مواد ہے۔ آج پاکستان ''پورون'' فلمیں دیکھنے کی فہرست میں اوپر سے اوپر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ معاشرے میں پائی جانے والی عدم برداشت اور فرسٹریشن ہے۔

جنسی حملہ کرنے والا انسان جن نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتا ہے۔ ان سب کے جڑ والدین کی غلط تربیت ہے۔ ''جوان'' افراد کس قسم کی مشغولیات میں مصروف ہیں۔ کیا یہ دیکھنا والدین کا فرض نہیں ہے؟ زینب کا قاتل کیا کر رہا تھا؟ اس کی فیملی کیوں بے خبر تھی؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق زینب کو دو دن تک بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ زینب کی زبان اور نازک اعضا بری طرح سے مضروب کیے گئے۔ آخر اس معصوم پری کا قصور کیا تھا۔

کیا قصور کی بے قصور زینب کو کبھی انصاف مل پائے گا؟ یا یہ واقعہ بھی وقت کی گرد تلے دب جائے گا؟

آج جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں لاقانونیت عام ہے۔ احتجاج کرنے والوں پر گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ نیٹ تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ غیر اخلاقی مواد ہر کسی کی دسترس میں ہے۔ معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتحال مایوس کن ہے۔ ایسے میں کوئی درندہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیئے کسی سطح تک جا سکتا ہے۔ پھولوں کی حفاظت کیجیئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ان کو مسل دے!

ذا پختونیم

پٹھان ایک قوم ہے اور پشتو ایک زبان۔ پشتو افغانسان میں اور پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ میں بولی جاتی ہے ہر پشتو بولنے والا انسان پٹھان نسل سے نہیں ہے یہ ایک زبان ہے جیسے پنجابی ایک زبان ہے اور اس کے بولنے والے سید بھی ہیں مرزا بھی ہیں جاٹ گجر اور راج پوت بھی ہیں اسی طرح سے پشتو بولنے والے افراد قوم کے اعتبار سے ذات کے لحاظ سے سید بھی ہیں گجر بھی ہیں ملک بھی ہیں اور بھی کئی ذاتوں سے ہیں۔ ایک غلط فہمی جو کہ رائج ہو چکی ہے کہ ہر پشتو بولنے والا پٹھان ہے بالکل غلط ہے پٹھان پنجابی بھی ہیں اردو اسپیکنگ بھی ہیں اس کی وضاحت کے لئے میں آپ کو تاریخ سے حوالے دونگی۔

1005 قبل مسیح

اصل پٹھان اپنا نام ونسب افغان ابن یرمیاہ ابن طالوت سے منسوب کرتے ہیں جو حضرت سلیمان کا سپاہ سالار اور ان کے ہیکل کا معمار تھا۔ ایک دوسری رویت کے مطابق حضرت سلیمان کے بیٹے کا نام افغان تھا اس کی نسل سے یہ قوم چلی پٹھان حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق کی اولاد میں سے ہیں اس لئے انکے قبائلی ناموں میں بھی یہ ذکر ہے۔ یوسف زئی قبیلہ حضرت یوسف کی نسل سے ہے۔

بنی اسرائیل کو اسلامی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے امت محمدیہ سے پہلے افضل العلمین ہونے کی فضیلت بھی بنی اسرائیل کو حاصل رہی۔

600 قبل مسیح

پٹھان یہودی النسل ہیں اور انکا تعلق بنی اسرائیل کے قبائل سے ہیں بخت نصر نے ان کے آباؤ اجداد کو فلسطین سے نکال دیا تھا اور فارس میں آباد کر دیا۔ یہاں سے وہ آہستہ آہستہ غور کے پہاڑوں یعنی ہرات اور مو جودہ ہزارہ جات کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور اسی ہجرت کے دوران ایرانیوں کے ساتھ وسیع پیمانے پہ ان کا

اختلاط ہوا اور یہ لوگ آباد ہو گئے ہندوستان والے ان کو پٹھان پاکستانی پٹھان اور پشتوں اور ایرانی افغان کہتے ہیں یہ اس وقت متعدد قبائل کا مجموعہ ہیں اور پاکستان کے مختلف حصوں میں آباد ہیں انکی ایک بڑی تعداد بلوچستان میں بھی آباد ہے۔

327 قبل مسیح

327 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ہندوستان پہ حملہ کیا اس زمانے میں آفریدی جو کہ پٹھانوں کا قبیلہ ہے یہ کوہ سفید کے باسی تھے۔خٹک کوہ سلیمان اور دریا سندھ کے اطراف میں آباد تھے۔ڈاڈ یکئی صوبہ قندھار اور پشاور میں مقیم تھے۔

ساتویں صدی

اسلام کا ظہور ہو چکا ہے حضرت محمد صل الہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کا اعلان کر چکے ہیں آپ عرب قبیلہ قریش کے ایک سردار خالد بن ولید کو داعی اسلام کی حیثیت سے اور دعوت اسلام دیتے ہیں قبیلہ اسلام قبول کرتا ہے یاد رہے یہ بنی اسرائیل ہونے ک باعث دین موسی پہ ہیں گویا کافر نہیں پٹھان دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو کبھی لادین نہیں تھی یہ اسلام سے قبل بھی اللہ کو مانتے تھے مشرک نہیں تھے اب قبیلہ کے سردار نے خالد بن ولید کی بیٹی سے شادی کی اور حضرت محمد نے ان کو پٹھان کا لقب دیا جس کا مطلب ایک ایسی سخت لکڑی ہے جس کو توڑا نہ جا سکے ساتھ پیشن گوئی بھی کی کہ یہ ایک ایسی قوم بنے گے جس ک کوئی شکست نہ دے سکے گا چنانچہ عربوں سے اختلاط ہوا۔

آٹھویں صدی

اس صدی میں پٹھان عرب خلیفہ کے جھنڈے تلے جمع ہوئے جن میں ترین ابدالی اور شیرانی شامل ہیں اور یوسف زئی، مہمند، گگیانی، ترکانڑی، داؤدزئی، خلیل محمد زئی اور شنواری شامل ہیں۔

پندرہویں صدی

پندرہویں صدی کے آغاز میں لودھی قبیلہ اور نیازی قبیلہ غزنی سے چلا اور ٹانک میں رہائش اختیار کی انکی غرض آمد تجارت تھی۔اس زمانے میں ہندوستان میں گھوڑوں کی بہت مانگ تھی۔

لودھی

اب لودھی ہندوستان میں طاقت حاصل کرنے لگے تو اقتدار میں آگئے اس پٹھانی قبیلے نے سید خاندان سے اقتدار چھینا اور دہلی کے تخت کے پہ حکومت کرنے لگے۔

بہلول لودھی سکندر لودھی ابراہیم لودھی

ب بہلول لودھی کے دور میں غزنی اور قلات سے پٹھان قبائل کی آمد ہوئی بہلول کے بعد سکندر بادشاہ بنا اور سکندر کے بعد ابراہیم ۔ابراہیم لودھی ایک کمزور بادشاہ ثابت ہوا مغل پٹھانوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے اور اقتدار پہ قابض ہو گئے اب یہ قبائل مستقل بنیادوں پہ ہندوستان میں آباد ہو گئے رفتہ رفتہ پنجابی اور اردو زبان تہذیب کا حصہ بن گئے رسم رواج اور وضع قطع بھی مقامی لوگوں جیسی ہوتی چلی گئی جب پاکستان بنا تو جالندھر لدھیانہ گورداسپور ہوشیار پور دیگر اور کئی علاقوں سی یہ پٹھان جو کہ پنجابی پٹھان اور اردو پٹھان کی حیثیت سے پاکستان ہجرت کر گئے پٹھانوں کی ایک خاص رسم جس کے مطابق یہ غیر پٹھان میں رشتہ داری نہن کرتے نے انکا جداگانہ وجود قائم رکھا ہوا ہے زبان متروک ہونے کے باوجود مخصوص خاندانی عادات آج بھی ان کے مزاج کا حصہ ہیں۔قومیں اللہ تعالی نے انسانوں کی پہچان کے لئے بنائی ہیں ہمارے مذہب اسلام میں یہی تعلیم دی گئی ہے۔مذکورہ بالا آرٹیکل اسی ضمن کی ایک کاوش ہے۔

پھٹیچر۔ پاکستان کے عدالتی نظام پہ ایک نظر

پاکستان میں ایک ہی چیز پھٹیچر ہے اور وہ ہے اس ملک کا عدالتی نظام۔ جسے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل انگریز نے اپنے مفاد کے لیے بنایا اور آج بھی یہی نظام اپنی تمام تر خامیوں کے ساتھ عوام کا خون چوس رہا ہے۔ انگریز نے اپنے عدالتی نظام کو تو وقت کی ضرورت کے تحت جدید کیا اور قابل عمل بنایا۔ جس کا اندازہ ان کی قابل ذکر ترقی سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کے عوام اُسی فرسودہ نظام کو بھگتنے پہ مجبور ہیں جہاں مقدمات کئی سال تک چلتے ہیں مدعی اپنے تمام مالی وسائل اور سفارشوں سے مدد لے کر بھی ناکام ہی رہتے ہیں معاشرے میں رشوت خوری کی سب سے بڑی مثال اسی عمل کے دوران دکھائی دیتی ہے۔ جو جج حضرات اپنے ضمیر کی آواز سنتے ہیں ان کو تبادلہ کی شکل خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ وکلاء منہ مانگی فیس وصول کرتے ہیں۔ ایسے کیسز بھی دیکھنے میں آئے جہاں انصاف ملنے تک ملزم زندگی کی بازی ہار گیا۔ خواتین باقی شعبوں کی طرح یہاں بھی استحصال کا شکار ہیں۔

طلاق، خلع، اولاد کی حوالگی، بچوں کا ماہانہ خرچ، زنا بالجبر، قتل، جائیداد میں حصہ سے محرومی، پسند کی شادی، اور اس نوعیت کے کئی مقدمات لڑتے لڑتے عورت کورہی سہی عزت، اخلاقی سپورٹ اور مال سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اکثریت اپنے حق کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے صبر کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جو انصاف اگلے جہاں پہ رکھ چھوڑتے ہیں۔ جذباتی افراد خون خرابہ اور مار دھاڑ پہ اتر آتے ہیں

جائیداد میں ناانصافی کا شکار صرف خواتین ہی نہیں مرد حضرات بھی ہوتے نظر آتے ہیں۔ ہبہ کے قانون کے تحت پسندیدہ اولاد کو جائیداد تحفتاً دے دی جاتی ہے۔ اور باقی وارثوں کا حق دبا لیا جاتا ہے۔ جس دین کے ہم پیروکار ہیں۔ وہ تو محبت کا مذہب ہے۔ دین اسلام میں وراثت کے قوانین واضح ہیں۔ کیا اللہ کے قانون

سے بہتر کوئی انسانی فیصلہ ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے معاشرے میں ٹوٹتے پھوٹتے خاندانی نظام کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قانون سازی کرنے والے وہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو جعلی ڈگریوں اور جعلی ووٹوں سے اسمبلی میں جا بیٹھتے ہیں قانون سازی، عام انسان کی مشکلات ان کا منشور نہیں ہے۔فوجی ڈکٹیٹر ہو یا جمہوریت کا نعرہ لگانے والا منتخب صاحبِ اقتدار۔

ہر قانون وہ جو انکے مفاد میں ہو۔ وہ یہ بناتے ہیں۔ اور اس پہ عمل درآمد کرواتے ہیں۔ٹیکس کے قوانین ہی دیکھ لیجیے؟۔ کیسے غریب عوام کو خون نچوڑتے ہیں! کیا ان کا کوئی خدا نہیں۔جس کا خوف انہیں شرم سار کرے۔ کیا ان کا کوئی مذہب نہیں جس کے اصول ان پہ بھی لاگو ہو۔کرسی کی لڑائی ان کا نصب العین ہے جس کے لیئے یہ ہمہ وقت اپنی سب قوتیں بروئے کار لاتے ہیں۔

آج پاکستان کو بیرونی سازشوں، دہشت گردی، اور دیگر کء مسائل کا سامنا ہے۔ایسے میں اگر چند غیر ملکی کھلاڑی پاکستان چلے آئے۔تو پاکستان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ دہشت گردی کو شکست دینے کے لیے ہم سب کو مل کے کام کرنا ہوگا۔ یہ آج ہمارے مسائل کا حل ہے۔

شک

چادر اور چار دیواری کا نظریہ بنیادی طور پہ اسلام کا پیش کردہ ہے جس کا مقصد معاشرے کو بے راہ روی سے بچانا ہے عورت پہ پردے کی فرضیت کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔ مرد اور عورت کی آزادانہ اختلاط سے خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے جس کی مثال آج مغربی معاشرے کے صورت میں موجود ہے حیو ان کی جبلت میں حلال حرام کا فرق نہیں رکھا گیا ہے وہ جہاں چاہتا ہے منہ مارتا ہے لیکن انسان کو اشرف الخلوق بنانے کا شرف ذمہ داریوں سے جڑا ہوا ہے نہ تو انسان کو آزادی دی گئی نہ اُسے کھلی چھٹی۔

اس پہ حدود لگائی گئی تاکہ معاشرہ اپنی بنیادیں قائم رکھ سکے۔ آج کا دور نفسانفسی کا دور ہے اسلام کے احکامات کو فرسودہ سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ معاشرتی برائیوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ دوسری طرف ایسی بیمار ذہنیت کی بھی کمی نہیں جو اندر ہی اندر اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں بظاہر تو یہ لوگ بہت قابل پڑھے لکھے اور اسلام پہ عمل پیرا نظر آتے ہیں لیکن عورت کو آج بھی اپنی جاگیر تصور کرتے ہیں انکی بیمار سوچ پردہ کے نام پہ اپنی عورتوں کو تو چادر اور چار دیواری میں قید کرتی ہے اور خود یہ عورتوں کے ساتھ ملازمت بھی کرتے ہیں مخلوط اداروں میں کام بھی کرتے ہیں خواتین سے گفتگو کرتے بھی پائے جاتے ہیں ان کی بیمار سوچ انکے ساتھ رہنے والی خواتین کو جو نقصان پہنچا رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کہ اسلام پہ عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کو پہنچ رہ ہے۔ ہر فرد ایک اکائی ہے معاشرے کی ایک اینٹ ہے دیوار کی افراد کی سوچ معاشرے کا چہرہ بناتی ہے۔

اپنی عورت کو سر سے پیر تک ملفوف دیکھنے کے خواہش رکھنے والے مرد حضرات خود تو اسلامی حلیہ اختیار کر لیں سر پہ عمامہ شریف باندھیں چہرے پہ شرعی داڑھی سجائیں شلوار ٹخنوں سے اونچی کریں غیر محرم خواتین سے اجتناب کریں۔ مغربی لباس زیب تن کر کے خواتین کے ساتھ آزادانہ ماحول میں کام کر کے یہ دوسروں کی

اصلاح کرنا چاہتے ہیں ایسی مُلا ذہنیت نے آج سب سے زیادہ اسلام کا چہرہ مسخ کیا ہے ایسے لوگ اپنے سے وابستہ خواتین کی سوچ پہ پہرا بٹھا کے اپنی انا کی تسکین کرتے ہیں اور نام اسلام کا بدنام کرتے ہیں۔ اسلام میں سب سے زیادہ زور خواتین کے حقوق پہ دیا گیا ہے۔ بیوی کے ساتھ عمدہ برتاؤ کی ترغیب دی گئی لیکن چونکہ یہ دوسروں کے ٹھیکے دار ہیں اس لیئے اپنے اعمال کی بجا؟ دوسروں کے اعمال کی فکر ہے یہ بیمار ذہنیت جس قسم کے نفسیاتی مسائل کو جنم دیتی ہے ان لوگوں سے وابستہ خواتین اور بچوں۔

ایک لمبے عرصہ تک اپنی بقا کی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ کاش کہ ان کو شعور ہو اسلام میں ہر انسان خواہ وہ مرد ہے یا عورت آپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے ہر انسان کے اعمال کی پوٹلی اس کے ساتھ اس کی قبر میں جائے گی تو پھر دوسروں کے دعوے دار بننے کا کیا جواز۔ کسی کی اصلاح کا شوق رکھنے والے ان مرد حضرات کو اپنی سوچ دوسروں پہ ٹھونسنے کی بجا؟ اپنا نقطہ نظر سمجھانا چاہیے لیکن اتنی معاملہ فہمی ہو تو دنیا جنت بن جائے اور یہ انسان مسلمان۔

ہر وہ عورت جو مذہبی شعور رکھتی ہے اور اسلامی فہم۔ وہ کبھی بھی چادر اور چار دیواری کو پامال نہیں کرتی۔ وہ یہ جانتی ہے کہ وہ جواب دہ ہے اللہ کے حضور ان کھوکھلے نام نہاد مجازی خداؤں کے حضور نہیں۔ اسلام میں مرد اور عورت برابر ہیں اعمال کرنے میں بھی اور جواب دہی میں بھی مرد کو شوہر کے روپ میں ایک درجہ زیادہ دیا گیا تا کہ معاشرہ اور گھر قائم رہ سکے۔ عورت کو مارنے، اس کا استحصال کرنے، اس کی سوچ کے اظہار پہ پابندی لگانے کا نام اسلام نہیں۔ ایسے ہی مجازی خداؤں کا نام میری ایک غزل

عورت جن کے لئے آج بھی پاؤں کی جوتی ہے

آشیانے میں جلاؤں جو چراغ

شک کو وہ اور ہوا دیتا ہے

(نادیہ عنبر لودھی)

قصہ شعر گوئی کا

شاعروں کی ایک بڑی تعداد تو وہ ہے جو کہ تاریخ کے پنوں میں جلوہ گر ہے غالب جن کے نمائندہ شاعر مانے جاتے ہیں ان سے زمانہ ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہے گا۔ کچھ وہ ہیں جن کو تخلیقی صلاحیت ودیعت کی گئی اور زمانہ سکول میں بیدار ہوگئی یہ ساری زندگی قلم کا پیچھا نہیں چھوڑتے چارو نا چار قلم دہائی دینے لگتا ہے اب مجھ کو بخش دو اسکول کے زمانے سے جو یہ شروع ہوتے پھر کبھی بس نہیں کرتے اور اکثر ان کی اپنی بس ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان بہت ہی ڈھیٹ مخلوق واقع ہوا ہے سولگا رہتا ہے آدھا دن تو ان کا فعلتن مفاعلن فاعلن میں گزرتا ہے باقی آدھا خیالوں میں اگر کوئی ان سے پوچھے کیوں لکھتے رہتے ہیں تو جواب ندارد۔ خطا اس میں بھی سوالی کی ہے پیٹ میں درد اٹھتا ہے تو لکھنا تو پڑتا ہے ورنہ ہاضمہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

آج کل ایک نئی قسم بھی شاعروں کی متعارف ہو چکی ہے جو شاعری کی تو الف بے نہیں جانتے لیکن ان کو شاعر کہلوانے کا بے حد جنون ہے نیٹ کی مہربانی سے یہ ڈھیٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاعری کی پیجز سے کلام اکٹھا کر کے مختلف گروپس میں بھیج کر داد پاتے ہیں لیکن نقل کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہے اب اوزان اور بحر کا علم نہ ہونے کی وجہ سے وزن سے خارج شاعری لگاتے رہتے ہیں جس پہ کم علم لوگ داد دیتے ہیں اور یہ خوش ہوتے ہیں۔ کچھ تو ان سے بھی دو دو ہاتھ آگے ہیں یہ شاعروں کو فرینڈ ایڈ کرتے ہیں پھر کلام کی فرمائش کرتے ہیں کہ غزل عنایت کی جائے کسی مشاعرے میں پڑھنی ہے۔ دیدہ دلیری تو ملاحظہ ہو ایسے ہی عاقل حیوانوں سے جب ہمارا واسطہ پڑتا ہے تو ہمیں اپنے اشرف المخلوق ہونے پہ شبہ سا ہونے لگتا ہے ہم بھی حاتم طائی کی قبر پہ لات مار کر کہتے ہیں آپ ایسا کیجئے ؟ ہمارا سارا کلام لے لیجئے۔ ہم اور لکھ لیں گے لیکن نسوانی جذبات کا اظہار مردانگی میں بدلنا آپ کا کام ہے۔

اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے ارشاد فرمایا جاتا ہے شعر تو کسی کا نہیں ہوتا جو پڑھے اسکا ہوتا ہے ایسے

لوگوں کو ہمارا مفت مشورہ ہے کہ دیوان غالب اپنے نام سے چھپوالیں اور ناموری کمائیں اس طرح سے شاعر کہلانے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور نام بھی کمالیں۔ جب ان کو سمجھایا جاتا ہے جو اللہ نے آپ کو بنایا وہ آپ کے لئے بہتر ہے وہی بنیے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔

ایک طبقہ ان جیسا مزید میدان میں ہے جو کہ تُک بندی کو شاعری سمجھتا ہے اور بحر سے خارج الفاظ چھپوا کر یہ شاعرات ایوارڈ بھی لیتی ہیں شاید ایوارڈ دینے والوں کو اپنے شاعر ہونے میں کوئی شک ہے یا علم عروض سے کوئی پرانی دشمنی ہے لکھیئے۔ پڑھیئے۔ کتاب سے محبت کیجئے۔ لیکن............

ننھے فرشتے

بے رنگ کلیاں بے نور جگنو
طاق میں گڑیاں رکھی ہیں
ننھی پریاں
آنکھوں میں خواب سجائے
تتلیاں پکڑتی ہیں
جگنو جیسی چمکتی آنکھوں والے
ننھے فرشتے
سحر کا استعارہ بن کر دمکتے ہیں
رنگ برنگی کلیاں
بہار کا نظارہ بن کر مہکتی ہیں
زندگی کا اشارہ بن کر لہکتی ہیں
تیرے مرے خوابوں کا
آنے والا کل ہیں
یہ بچے ہمارا مستقبل ہیں

بچپن ہر انسان کی زندگی کا خوش نما ترین دور ہے۔جس کی یادیں عمر بھر ہمراہ رہتی ہیں۔لیکن کبھی کبھی ان خوب صورت یادوں کو کوءسفاک لمحہ ڈراؤنا خواب بنا دیتا ہے۔یہ کلیاں اپنا رنگ کھو دیتی ہیں۔جگنو بے نور ہو جاتے ہیں۔ان کو مسلنے والے بے حس انسان جس درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا اندازہ وکٹم شکار ہونے

والے بچے ہی کر سکتے ہیں۔ساری دنیا اس حوالے سے شدید تفکر کا اظہار کر رہی ہے۔بچوں کا جنسی استحصال کوء ن ء بات نہیں ساری دنیا میں اس قسم کے واقعات ہو رہے ہیں ساؤتھ افریقہ ،انڈیا ،زمبابوے ،انگلینڈ اور امریکہ ایسے پانچ مملک ہیں جہاں شرح سب سے زیادہ ہے۔ایک اندازے کے مطابق پانچ میں سے ایک لڑکی اور بیس میں سے ایک لڑکا جنسی استحصال کا شکار ہوتے ہیں پاکستان میں بھی جس تواتر سے اس ظالمانہ فعل کے بارے میں خبریں آرہی ہیں وہ تشویش کن ہیں۔ان کے مطابق 2015 میں جنسی تشدد کے کل 3768 واقعات رپورٹ ہوئے اور بے شمار واقعات ایسے ہیں جو بدنامی کے خوف سے چھپا لئے گئے۔ بچے اور ان کے والدین بدنامی کے ڈر دباؤ اور خوف کی وجہ سے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ بچہ جو پہلے ہی اس سانحے سے گزر کر ذہنی اور جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اسے مزید خاموشی اور بزدلی کا درس دیا جاتا ہے اور اگر ہمت کر کے یہ والدین احتجاج کی کوشش کریں تو معاشرہ منفی ردعمل دکھاتا ہے۔یہ پہلو مزید استحصال کی راہ فراہم کرتا ہے۔

ایک سروے کے مطابق متاثرہ بچوں میں سے اکثریت کی عمر گیارہ سے پندرہ سال تک ہوتی ہیں لیکن کچھ شواہد ایسے بھی ہیں کہ پانچ سال تک کے بچوں کو بھی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔دور حاضر میں جب انسان پہلے سے زیادہ تہذیب یافتہ ہے ایسے واقعات میں کمی آنے کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے شاید اس کی ایک وجہ awareness ہے۔جس کے منفی پہلو کو زیادہ لیا جا رہا ہے۔ایک وجہ ماں باپ کی گوناگوں مصروفیت بھی ہے۔عورت یعنی ماں بھی معاشی تگ ودو میں مرد کے شانہ بہ شانہ ہے۔ بچے کو نشست ،گفتگو اور ایسے مسائل پہ اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔پہلے تو جنسی استحصال کا مفہوم واضح کرنا ہوگا۔بچے کے ساتھ جنسی زیادتی، جنسی حملے ،جنسی ہراساں ،جنسی عمل کی ترغیب دینا یا اشارے کرنا سب جنسی استحصال میں شامل ہے اور کبھی کبھی یہ حرکات بدترین جنسی تشدد پہ منتج ہوتی ہیں۔بچوں کو اس استحصال کا زیادہ خطرہ افراد خانہ رشتیدار اور ہمسائے وغیرہ سے ہوتا ہے بعض اوقات گھریلو ملازم بھی ملوث پائے جاتے ہیں۔معصوم بچوں پہ جنسی حملے اور زیادتی کے 88 فی صد واقعات گھر میں ہی ہوئے۔لڑکوں میں زیادہ خطرناک ان کے اساتذہ اور اجنبی افراد ہوتے ہیں جب کہ معاشرے کے دیگر افراد جن سے بچوں کا رابطہ رہتا ہے جیسے دکاندار وغیرہ دونوں کے لئے یکساں

طور پہ خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔زیادہ تر زیادتی کرنے والے افراد اجنبی نہیں ہوتے لہذا پکڑے جانے کے خوف سے بچوں کا قتل تک کر دیا جاتا ہے۔قدامت پسند پاکستانی معاشرہ جس میں جنس کو ممنوعہ موضوع سمجھا جاتا ہے اب اجتماعی جنسی درندگی کی لپیٹ میں ہے۔پاکستان کے شہر قصور میں تقریباً تین سو بچوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی طویل عرصہ تک کی جاتی رہی اور پھران کی ویڈیوز بنا کر ان کو بلیک میل کیا جاتا رہا اس کے بعد سوات میں بھی ایسا ہی واقعہ دیکھنے میں آیا جہاں سترہ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی۔

پاکستان کی چالیس فی صد آبادی پندرہ سال سے کم عمر افراد پہ مشتمل ہے۔ان بچوں کو جہاں اور مسائل کا سامنا ہے وہاں ایک گمبھیر مسئلہ جنسی استحصال بھی ہے۔بچے کی تربیت تعلیم ہی صرف فرض نہن ہے بلکہ ان ننھے فرشتوں کو تحفظ دینا بھی ہمارا فرض ہیسے بچے جو بدقسمتی سے کسی جنسی درندے کی ہوس کا شکار نشانہ بنتے ہیں۔احساس جرم، نا امیدی، خوف، تنہاء، اداسی اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ یہ بچے اپنے خول میں بند ہونے لگتے ہیں اور انکے یہ نفسیاتی مسائل بڑھتے رہتے ہیں۔اس ضمن میں ماؤں کا کردار اہم ہے بچوں کو اعتماد میں لیں ان میں شعور پیدا کریں انہیں بیڈ اور گڈ ٹچ کا فرق سمجھائیں انہیں بتائیں کہ تم انتہاء خاص ہو۔تمہارا بدن تمہاری ملکیت ہے۔اگر کوء اس کو چھونے کی کوشش کرے تو تمہیں انکار کا حق حاصل ہے۔اگر کوء تمہیں پریشان کرے تو مجھے بتاؤ۔میں تمہاری مدد کرونگی۔بچے کو شیشے کی گڑیا بنانے کے بجائے حالات سے لڑنا سکھائیں۔جب بچے میں خوف کی علامات نظر آئیں یا تنہاء پسندی بڑھے تو اس کے پیچھے چھپے حقائق جاننے کی کوشیش کریں۔پہلے تو بچوں کی حفاظت کا خیال رکھا جائے لیکن ان کی تربیت بھی اس انداز میں کی جائے کہ وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے ہر قسم کی زیادتی سے بچ سکیں۔بچے کو معاشرے سے کاٹ دینا مسلئے کا حل نہیں ہے اس سے بچے میں اور دیگر نوعیت کے نفسیاتی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔اگر خدانخواستہ آپ کا بچہ زیادتی کا شکار ہو جائے تو اسے ٹروما سے نکالنے کے لئے کسی نفسیاتی معالج کی مدد لیجئے خاموشی سے دبانے کی کوشش مت کی جائے۔تاکہ بچہ نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہونے سے بچ جائے اور معاشرے کا فعال شہری بن سکے بچے کو ہمت دیجئے۔احتیاط کی ضرورت ہے اور ان تجاویز پر عمل درآمد کی بھی۔اسی طرح ہمارا کل محفوظ ہو سکتا ہے۔

اعتبار ساجد

جناب سید اعتبار ساجد کا انٹرویو جو خبریں مانچسٹر میں اکتوبر 2016 میں شائع ہوا۔

شاعری کا معتبر نام، ایک عظیم انسان، ادب کی معراج، ساٹھ کتابوں کے خالق، شاعر، نثر نگار، مضمون نگار، کالم نگار، استاد، ڈرامہ نگار، سفر نامے کے مصنف، ہمہ جہت شخصیت، خوب صورت لب و لہجہ کے مالک جناب اعتبار ساجد صاحب۔

پروین شاکر کے بعد مری تلاش جناب اعتبار ساجد پہ آ کر رُکی۔ پاکستان کے ادبی افق پہ بیس پچیس سال پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ دیگر ادبی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ان کے انٹرویو کا مجھے موقع ملا۔ انکی پر مشفق ہستی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور بہت کچھ سیکھنے کا بھی۔

اسلام علیکم سر: بہت شکریہ سر قیمتی وقت میں سے چند لمحات ہمارے لیے نکالنے کے لیے

اعتبار ساجد: مجھے خوشی ہوگی آپ سے بات کر کے

نادیہ عنبر: سر آپ کہاں پیدا ہوئے؟

اعتبار ساجد: مری پیدائش ملتان کی ہے والدین یو پی بہار سے تھے ہم اردو سپیکنگ ہیں

یہی آپ کی شستہ اردو کا راز ہے؟

اعتبار ساجد جی اردو ہماری مادری زبان ہے

نادیہ عنبر: سر کچھ بچپن کے بارے میں بتائیے؟ کتنے بہن بھائی تھے آپ؟

اعتبار ساجد: ہم سات بہن بھائی تھے اور میں سب سے بڑا ہوں

نادیہ عنبر: سر آپ کی والد سے متعلق نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا انتہائی جذباتی اور خوب صورت انداز ہے

اعتبار ساجد: جی والد سے بہت قریب تھا میں

نادیہ عنبر: اس کی وجہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونا ہے اور حساس فطرت؟

اعتبار ساجد: شاید یہی بات ہے میں سردار قبیلہ تھا سب سے بڑے تھا

نادیہ عنبر: آپ بارش کا پہلا قطرہ بنے یا اور کوئی خاندان کا فرد بھی اس ادبی میدان میں تھا؟

اعتبار ساجد: مجھ سے ہی آغاز ہوا

نادیہ عنبر: سر کچھ اپنے بچپن کے بارے میں بتایئے؟

اعتبار ساجد: بچپن ملتان میں گزرا ایاز صدیقی کی بیٹھک میں ادبی محافل میں شرکت کا موقع ملا جہاں ادبی تربیت ہوئی پروفیسر عاشق ارشد، ملتانی شاعر۔ خیال امروہی،، اقبال ارشد، حسین ساغر، محسن نقوی،، اور ندیم اصغر سید کی رفاقت میسر آئی

اور بھی کئی ادبی شخصیات سے فیض حاصل کیا

نادیہ عنبر: سر یہی وجہ ہے آپ کی ادبی شخصیت کی قدآوری کی

اعتبار ساجد: شاید! میرے والد کسٹم میں تھے ملتان سے انکی ٹرانسفر کوئٹہ ہوئی تو زندگی کا ایک حصہ کوئٹہ گزارا

کوئٹہ میں اردو ادب کی تعلیم مکمل کی اعزاز کے ساتھ پھر ڈگری کالج کوئٹہ میں لیکچرر مقرر ہوا ملتان ابتدائی درس گاہ تھی کوئٹہ میں شاعری نے جنم لیا

شاعری کی پہلی کتاب منظر عام پہ آئی جو کہ لاہور سے چھپوائی

لاہور ادبی مرکز تھا شاعروں ادیبوں کا گڑھ اب تو پاک ٹی ہاوس ہی رہ گیا اس کے بعد اسلام آباد منتقل ہو گیا وفاقی کالجز میں پڑھایا ریٹائرمنٹ کے بعد اب لاہور میں رہائش ہے لیکن علم وادب اور تدریس کا سلسلہ جاری وساری ہے

نادیہ عنبر: سر اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتایئے؟

کب رشتہ ازدواج سے منسلک ہو؟؟

اعتبار ساجد: 1994 میں

نادیہ عنبر: بچوں کی تعداد؟

اعتبار ساجد: دو بیٹے ایک بیٹی

نادیہ عنبر: ان میں سے کوئی فنون لطیفہ سے وابستہ ہے؟

اعتبار ساجد میرا بڑا بیٹا سید حسن اعتبار کو گائیکی کا شوق ہے اور وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں

شریک حیات کو کیسا پایا،؟

نادیہ عنبر: بہت اچھا وہ گھر کا بچوں کا بہت خیال رکھتی ہیں

نادیہ عنبر: تخلیق کار بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں عام لوگوں کے ساتھ انکی ذہنی ہم آہنگی مشکل سے ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

اعتبار ساجد: ذہنی ہم آہنگی شریک حیات کے ساتھ زمینی سطح پر ہے نچی سطح پر ہے۔ بلندی پر نہیں ہے لیکن اچھی زندگی گزر رہی ہے

نادیہ عنبر: سر ہم خیال اور ہم مزاج لوگوں کا زندگی میں ہونا ہمارے اردگرد ہونا اور پھر ہم سفر ہونا بہت مشکل ہے؟

اعتبار ساجد: جی ایسا ہی ہے لیکن میں خود اپنی راہیں متعین کر لیتا ہوں۔

نادیہ عنبر: کچھ اپنی عادات کے بارے میں بتایئے؟

اعتبار ساجد: محترمہ! میں قناعت پسند آدمی ہوں

تنہائی پسند ہوں۔حسن فطرت کا شیدائی ہوں

باغات کی سیر پسند ہے

حساس طبعیت ہے

دوست محدود تعداد میں ہیں

نادیہ عنبر: زندگی کو کیسا دیکھتے ہیں

اعتبار ساجد: زندگی ٹھیک ہے افسردگی سے قریب نہیں ہے

نادیہ عنبر سر: افسردگی سے کیا مراد ہے آپ کی؟

تبار ساجد: افسردگی اندرونی کیفیت ہے جو خارجی عوامل سے پیدا ہوتی ہے۔ میں کئی تجربات کی مسافت طے کر کے آیا ہوں اس لئے زندگی سے محبت ہے

نادیہ عنبر: لکھاری کی زندگی میں تنہائی ایک مسلمہ حقیقت ہے؟

اعتبار ساجد: تنہائی ذہن کی ہوتی ہے جسم کی نہیں

نادیہ عنبر: شاعری کا آغاز کتنے سال کی عمر سے کیا

اعتبار ساجد: پیدائشی شاعر ہوں جو پہلا شعر لکھا بحر میں تھا لیکن آغاز نثر سے کیا

نادیہ عنبر: سر آپ سلف میڈ آدمی ہیں

اعتبار ساجد: جی بالکل

نادیہ عنبر: اپنی کتابوں کے بارے میں بتایئے

میں ساٹھ کتابیں لکھ چکا ہوں میری کتابوں میں شاعری کا ایک مجموعہ کوئی شام ادھار دو اٹھارہ دفعہ چھپا ہے

میں پیسے دے کر کتابیں نہیں چھپواتا بلکہ رائیلٹی لیتا ہوں

پہلے شعری مجموعے کا نام ''دستک بند کواڑوں پر'' تھا

میرے ڈرامے پی ٹی وی پر نشر ہوتے رہے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لکھنے کا سلسلہ جاری ہے مرے کام پہ ایم فل ہو چکا ہے مختلف ادبی رسائل میں لکھا جاتا ہے

نادیہ عنبر: سر نئے شاعروں کو کیا پیغام دیں گے؟

اعتبار ساجد: تخلیقی کام کو سنجیدہ سمجھ کر کریں شہرت کے لئے نہیں شہرت خریدیں مت

شہرت چٹائی سے اٹھ کر تخت رواں تک پہنچتی ہے

شاعری محنت طلب اور سنجیدہ کام ہے اس کو سیکھ کر کیجئے

نادیہ عنبر: سر بہت نوازش شکریہ

حج

حج صرف اسلام کا ایک رُکن ہی نہیں عشق وسرمستی کی داستان بھی ہے۔ ہر مسلمان کے لیئے اسلام کی تعلیم فرض ہے۔ پھر جو عمل کی طرف بڑھا نماز اسکی محبت بن گئی روزہ اس کے لیئے عشق بن گیا اور حج دیوانگی۔ دو سفید چادروں میں عشق الٰہی میں دیوانہ وار جان مال اور ساری قوتیں بروز کار لانا عشق ہی تو ہے یہی آشفتہ سروں کو اللہ کے گھر مکے کی طرف کھینچتا ہے جو دنیا میں مثل فردوس بریں ہے جہاں عشق حقیقی سے لگی لو دیوانہ وار طواف کرواتی ہے۔ بی بی حاجرہ کی اس بے قراری کو جو نبی اسماعیل علیہ اسلام کے لیئے کی گئی دہراتی ہے۔ یہ عشق ومستی کا سفر نبی ابراہیم علیہ اسلام سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ابراہیم جو بچپن سے اللہ کی راہ میں قربانی دیتے آ؟۔ آزر کا گھر ہو یا بت خانہ کفر ہو ہر جگہ توحید ربی کے لیئے آپ اٹھے لڑے اور کبھی نہ جھکے۔ رود بادشاہ نے آگ لگانے کی تیاری جب کی۔ آپ نہ ڈرے نہ گھبرا؟۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک بڑا الاؤ دہکا دیا گیا حدت اس قدر تھی کہ قریب جانا ناممکن تھا آگ کی تپش۔ بال اور جلد جھلسا؟ دیتی۔ اب نبی ابراہیم علیہ اسلام کو تائب ہونے کا کہا گیا بتوں کو مان کر جان بچانے کے لیئے اکسایا جانے لگا لیکن آپ نے اسی رب پہ یقین رکھا آگ کے اندر پھینکنا آدمیوں کے بس سے باہر تھا منجیق بنائی گئی۔ آپ ک منجنیق میں باندھا گیا بارش کا فرشتہ حاضر ہوا بارش کی اجازت طلب کی گئی۔ آپ نے پوچھا تمہیں اللہ نے بھیجا ہے جواب ملا نہیں۔ میں آپ کو جلتا نہیں دیکھ سکتا۔ فرمایا جاؤ مرا رب مرے حال سے واقف ہے۔ حضرت جبرآئیل تڑپتے ہوئے آئے۔ ان سے بھی یہی سوال کیا گیا جواب ملا۔ نہیں۔ خود آیا ہوں۔ فرمایا جناب ابراہیم علیہ اسلام نے۔ جاؤ مرا حال مرے رب کے سامنے ہے وہ مجھے بچا لے گا۔ اللہ کے علاوہ کسی سے مدد نہیں لونگا۔ آگ دہک رہی تھی پرندے اپنی اپنی چونچوں میں پانی بھر بھر کر لاتے اور آگ بجھانے کی کوشش کرتے لیکن اس آگ کے لئے ان کافروں نے بہت عرصہ سے تیاری کی تھی آپ کو پھینک دیا گیا آپ آگ کے درمیان میں گرے اللہ تعالی کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ اور گلزار بن گئی۔

آپ کی قوت ایمانی نے آپ کو سرخ رو کیا۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستان پیدا

پچانوے سال کی عمر میں اللہ تعالی نے باندی حاجرہ سے صاحب اولاد کیا جن کا نام اسماعیل رکھا گیا تیرہ برس کی عمر کو پہنچے تو خواب میں قربانی کا حکم ملا تین رات مسلسل یہی خواب دیکھا تو نبی اسماعیل علیہ اسلام سے ذکر کیا وہ بولے بابا آپ مجھے فرمانبردار پائیں گے۔بانی کی نیت سے پہاڑ کی طرف روانہ ہو؟ نبی اسماعیل نے اپنے والد سے کہا" بابا مرا چہرہ نیچے کی طرف رکھیئے گا۔چھری خوب تیز کر لیجئے گا۔مری والدہ کو مرے خون والے کپڑے مت دکھایئے گا"۔آپ نے اللہ کے حکم کی تکمیل کی اور نبی اسماعیل علیہ اسلام کی گردن پہ چھری چلا دی۔جنت سے ایک دنبا بھیجا گیا جو کہ آپ کی جگہ ذبح ہوا۔اور اللہ تعالی نے آپ کی حفاظت فرمائی اللہ تعالی کے اس امتحان میں بھی آپ کامیاب ہو؟۔اور آپ کی اس قربانی کو قیامت تک سنت بنا دیا گیا۔اللہ تعالی کبھی کسی مسلمان کی قربانی کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ بہت قدر دان ہے۔بس ایمان ابراہیمی کی ضرورت ہے۔نبی اسماعیل علیہ اسلام کی عمر مبارک تیس سال ہوئی تو نبی ابراہیم مکہ تشریف لا؟ اور آپ کو تعمیر کعبہ کا حکم دیا۔دونوں باپ بیٹا پرانی بنیادوں پہ اللہ کے گھر کی تعمیر کرنے لگے۔ نبی ابراہیم علیہ اسلام ایک پتھر پہ کھڑے ہو کر اینٹیں لگاتے۔معجزے سے یہ پتھر بلند ہوتا اور پھر نیچے واپس آتا جہاں تک ضرورت ہوتی۔ پھر اس تعمیر کا ذکر قرآن پاک کی زینت بنا دیا گیا سنت ابراہیمی کو سنت محمد بنا کر آج تک اللہ تعالی نے نبی ابراہیم کی قربانیوں کو زندہ رکھا۔

ہجری میں مکہ فتح ہوا۔اور نو ہجری میں حج فرض کر دیا گیا۔ہجری میں حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ بارہ ہزار مسلمانوں کو لیا اور عازم حج ہو؟۔آپ کا قافلہ ستائیس ذی القعد کو روانہ ہوا۔راستے میں سے بھی مسلمان شامل ہوتے گئے اس طرح یہ تعداد ایک لاکھ ہوگئی۔مکہ کے مقام پہ پہنچے قافلے کو پڑاؤ کا حکم دے دیا گیا ابوہ کے مقام پہ ایک شہر آباد ہو گیا انتظامات سے مطمئن ہو کر مرے نبی حضرت محمد صل للہ علیہ وآلہ

وسلم اپنی والدہ بی بی آمنہ کی قبر پہ حاضری دینے پہنچے۔آپ کی عمر مبارک اس وقت تریسٹھ برس تھی جب آپ کی والدہ کا انتقال ہوا آپ کی عمر مبارک چھ سال تھی اس مقام پہ دوران سفر آپکی والدہ انتقال فرما گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر آپ کا غم تازہ ہوگیا پہاڑوں کے بیچ اجاڑ جگہ پہ بی بی آمنہ مدفن ہیں۔آپ قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر رونے لگے اتنا رو؟ کہ یتیمی کا کرب بھی تڑپ اٹھا۔رات وہیں گزار دی۔صبح قافلہ کی روانگی ہوئی ذوالحلیفہ کے مقام پہ احرام باندھا گیا لبیک لبیک کی صدا سے فضا جھوم اٹھی فرزندان توحید کا یہ قافلہ مکہ کی جانب چلا۔ مکہ معظّمہ پہنچے۔ یہاں آپ نے مشرکانہ رسوٴمات کا خاتمہ کیا۔ اسلام سے قبل کفار بھی حج ادا کرتے تھےاور برہنہ طواف کعبہ کرتے تھے آپ کی قیادت میں صدیوں کے بعد خالص دین ابراہیمی پر مناسک حج ادا کیے گئے۔آپ نے مقام سرف میں قیام فرمایا۔ مقام ابراہیمی میں دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد کوہ صفا پہ چڑھ کر تعلیمات اسلامیہ کولوگوں کے سامنے پیش کیا۔کوہ صفا کے بعد آپ نے کوہ مروہ پہ مناسک حج طواف اور سعی کی اور آٹھ ذوالحجہ کو مقام منا میں قیام فرمایا آپ نے سر منڈوایا موٴہ مبارک صحابہ میں تقسیم کیئے ناخن کاٹ کر زمین میں دبا؟ اب قربانی کا مرحلہ تھا۔سو اونٹ آپ نے قربان کیئے۔تریسٹھ اپنے دست مبارک سے اور باقی حضرت علی نے زبح فرما؟ اس کے بعد حضرت علی سے فرمایا ہر اونٹ کے گوشت میں سے ایک ایک بوٹی لے کر سالن پکاؤ۔وہ پکا کرلا؟ آپ نے کھانا کھایا۔ باقی سارا گوشت تقسیم فرمادیا۔اس کے بعد خطبہ دیا گیا جو کہ خطبہ حجتہ الوداع کے نام سے مشہور ہے یہ نو ذوالحجہ دس ہجری کو دیا گیا جو کہ انسانی حقوق کا ایسا چارٹر ہے جس پہ عمل اگر کیا جائے تو دنیا جنت بن جائے۔آپ صل للہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''سب تعریف اللہ کے لیئے ہے۔ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔اسی سے مدد چاہتے ہیں۔اسی سے معافی مانگتے ہیں۔اسی کے پاس توبہ کرتے ہیں۔اور ہم اللہ ہی کے ہاں اپنے نفسوں کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

جس کو اللہ ہدایت دے تو پھر کوئی اسے بھٹکا نہیں سکتا اور جسے اللہ گمراہ کردے اس کو کوئی راہ ہدایت دکھا نہیں سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور۔رسول ہے۔اللہ! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید اور اسکی اطاعت پہ

پُرزور طور پہ آمادہ کرتا ہوں اور میں اسی سے ابتدا کرتا ہوں جو بھلائی ہے۔لوگو! میری بات سُن لو مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں تم سے اس قیام گاہ میں اس سال کے بعد پھر کبھی ملاقات کرسکوں۔ہاں جاہلیت کے تمام دستور آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کے سبب سے۔خُدا سے انسان مومن ہوتا ہے اور اس کا نافرمان شقی۔تم سب کے سب آدم کی اولاد میں سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی حرام ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی اس شہر کی اور اس مہینے کی حُرمت کرتے ہو۔دیکھو عنقریب تمہیں خُدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔خبردار مرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔جاہلیت کے قتل کے تمام جھگڑے میں ملیامیٹ کرتا ہوں پہلا خون جو باطل کیا جاتا ہے وہ ربعیہ بن حارث عبدالمطلب کے بیٹے کا ہے۔

اگر کسی کے پاس امانت ہو تو وہ اس کو اس کے مالک کو ادا کرے اور اگر سود ہو تو وہ موقوف کر دیا گیا ہے۔ہاں تمہارا سرمایہ مل جائے گا۔نہ تم ظلم کرو نہ تم پہ ظلم کی جائے گا۔اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ سود ختم کر دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

لوگو! تمہاری زمین میں شیطان اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے لیکن دیگر چھوٹے گناہوں میں اپنی اطاعت کیے جانے پر خوش ہے اس لیئے اپنا دین اس سے محفوظ رکھو۔اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد اسی دن سے بارہ ہے جب اللہ نے زمین و آسمان پیدا کیئے ان میں سے چار حُرمت والے ہیں تین ذیقعد، ذوالحجہ اور محرم لگاتار ہیں اور رجب اکیلا ہے۔

لوگو! اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیئے حلال بنایا۔اور تمہارا حق عورتوں پہ اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں۔لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو اور عورتوں کا حق تم پر یہ ہے تم ان کو اچھے طرح کھلاؤ، اچھے طرح پہناؤ۔

تمہارے غلام ہیں جو خود کھلاؤ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

خدا نے وراثت میں ہر حقدار کو حق دیا ہے۔اب کسی وارث کے لیئے وراثت جائز نہیں۔لڑکا اس کا وارث ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا ہو، زنا کار کے لیئے پتھر ہے اور ان کے حساب خدا کے ذمے ہے۔

عورت کو اپنے شوہر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں۔قرض ادا کیا جائے۔عطیہ لوٹایا جائے۔ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

مجرم اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار نہیں۔

اگر کٹی ہوئی ناک کا کوئی حبشی بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق کے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمابرداری کرو۔

لوگو! نہ تو مرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے۔خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔خانہ خدا کا حج بجالاؤ۔

میں تم ایک چیز کو چھوڑتا ہوں۔اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے۔وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔''

اس جامع خطبہ کے بعد نبی محمد عربی نے مجمع سے فرمایا:

''لوگو! قیامت کے دن خدا مری نسبت پوچھے گا تو کیا جواب دو گے؟::

صحابہ نے عرض کیا۔

''کہیں گے آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔''

آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور فرمایا۔''اے خدا تو گواہ رہنا''۔تین دفعہ کہا اور پھر ہدایت فرمائی۔''جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو یہ باتیں پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں۔''

یہ ہمارے نبی محمد عربی کا آخری پیغام ساری نوع انسانیت کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بطور خاص ہے۔جس کو سمجھنے کی آج شدید ضرورت ہے اس دعوت انقلاب پہ عمل میں مری آپ کی ساری دنیا کی نجات ہے

مابعد نوآبادیات، شناخت اور استعماری اجارہ داری

ہر انسانی معاشرہ اپنے رسم و رواج کو لے کر چلتا ہے۔ثقافتی معیار کسی بھی معاشرے میں قابل قبول طرز عمل کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ کسی مخصوص صورت حال میں انسانی رویے، لباس، زبان اور طرز عمل کے لیے ایک رہنما اصول کے طور پر سامنے آتا ہے، یہ ایک سماجی گروپ میں توقعات کے نمونے کے طور پر فعال رہتا ہے۔کسی ملک کے باشندے کسی خاص مذہب اور رسوم و رواج کے پابند ہوتے ہیں جو کہ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

نوآبادیاتی نظام سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے آزاد علاقے پر اپنا تسلط قائم کر کے اس کے رہنے والوں کی آزادی سلب کر کے اس علاقے میں نئی آبادیاں قائم کرنا ہے اور پھر اسے توسیع دینا ہے۔ جہاں یہ نوآبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں پر قابض گروہ عموماً تسلط قائم رکھنے کے لیے اپنے قوانین مسلط کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ قابض گروہ اور نوآبادی کے اصل باشندوں کے درمیان ناانصافی اور جبر پر مبنی ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے جس میں اصل باشندوں کا استحصال کرنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔

انگریزی میں نوآبادی کے لیے colonialism کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔جس کا مطلب نئی آبادی بنانا ہے۔ان آبادیوں کے بنانے والوں کے بارے میں ہر طرح کا علم نوآبادیات کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقتور ہمیشہ کمزور کو یرغمال بنا کر رکھتا ہے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔نوآبادیاتی نظام میں عام طور دو اہم کردار ہوتے ہیں ایک مقامی لوگ اور دوسرے نئے آنے والے یعنی آبادکار۔ مقامی لوگوں سے مراد کسی بھی خطہ میں رہنے والے رہائش پذیر لوگ ہیں۔ان دونوں کرداروں کا آپس میں ایک تعلق ہوتا ہے اور اسی تعلق کی بنا پر ہی اجارہ داری قائم ہوتی ہے اور ایک خطے کا استحصال ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کرنے، حق چھیننے اور اپنی طاقت کا سکہ منوانے کے لیے ایک

دوسرے وجود کی ضرورت رہتی ہے ۔مابعد نو آبادیات Postcolonialism پوسٹ کلونیلازم میں کسی نوآبادیات کار کو کسی ملک پر چڑھائی کر کے اپنی پالیسیاں منوانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گلوبلائزیشن Globalization کے ذریعے حکومت کی جاتی ہے یوں ترقی یافتہ اقوام ترقی پذیر ممالک پر حکمرانی کرتی ہیں۔اسی نظام کے تحت کسی ملک کی معیشت کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔موجودہ دور میں اس کی وجہ سے ہمارا ملک پاکستان جس معاشی، اخلاقی، سیلابی اور سیاسی بحران سے گزر رہا ہے۔وہ سب کے سامنے ہیں۔عام فرد غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے۔اور امیر بے حس۔ہماری عوام انفرادی طور پر اپنی خود مختاری گم کرتی جارہی ہے۔

نہ صرف یہ کہ ہماری آزادی اور خود مختاری داؤ پر لگی ہوئی ہے بلکہ ہم اپنے دین اسلام سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔گلوبلائزیشن کی اس صورت حال نے نیٹ کی یلغار کے ساتھ مل کر پاکستان کی ثقافتی، ادبی، سماجی، معاشی، مذہبی، اخلاقی سب قدریں پامال کردی ہیں۔موجودہ دور کی اس اہم دریافت نیٹ نے دنیا کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔اس نیٹ کی دنیا کے بھی تین درجات ہیں سب سے اوپر والے حصے کا نام سرفیس ویب ہے جسکا استعمال آپ اور میں کرتے ہیں دنیا کی آبادی کا تقریباً چار فی صد حصہ اسے استعمال کرتا ہے اس میں گوگل ،فیس بک، انسٹا، یوٹیوب اور دیگر ایپس ہیں اس کے بعد ڈیپ نیٹ ہے اس کو وہ کمپنیاں استعمال کرتی ہیں جو کہ اس وقت ساری دنیا کو کنٹرول کر رہی ہیں یہ استعماری طاقتوں کے دنیا پر کنٹرول کے نئے طریقے ہیں ان کے پاس صارفین کا سارا ڈیٹا ہے اور ایک ریسرچ کے مطابق 2050ء تک یہ کمپنیز مشینوں کے ذریعے انسانوں کو اپنا غلام بنالیں گی۔اب ہے تیسرا حصہ جو کہ ڈارک ویب کہلاتا ہے۔یہ انڈر ورلڈ کی نئی شکل ہے اس میں انسانوں کی فروخت، جنسی مواد، قتل، ہتھیاروں کی خرید و فروخت اور دیگر کئی قسم کی خفیہ نقل وحرکت کی جاتی ہے۔اس کی معلومات خفیہ ہیں۔ان تک رسائی ناممکن ہے۔

انٹرنیٹ کا معاملہ غیر اخلاقی مواد کی فراہمی سے آگے نکل چکا ہے۔یہ نوجوان نسل کے ترکِ دین تک پہنچ چکا ہے۔یہودی تنظیم فری میسن دنیا میں ۱۷۱۷ سے فعال ہے فری میسن (freemason) ایک بین الاقوامی یہودی تنظیم ہے۔جس کا مقصد دنیا میں دجال اور دجالی ریاست کی راہ ہموار کرنا ہے۔اس میں بیس برس سے بڑی عمر کے لوگ ممبر بنائے جاتے ہیں۔افسوس کہ نیٹ کے ذریعے یہ لوگ مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے دین

میں داخل کرر ہے ہیں ۔ان کے آن لائن سیشنز ہوتے ہیں ۔جن میں بڑی تعداد مسلمانوں خاص طور پر ایرانیوں کی ہے ۔تمام مذاہب کے کمزور عقیدہ لوگوں کو الومناتی Illuminati گروہ میں شامل کرنے جیسے اہداف پر خاموشی سے کام کیا جار ہا ہے۔اس تنظیم کی خفیہ سرگرمیاں اور مقاصد بہت ہولناک ہیں۔

Melchizedek میلچیز یڈیک جیسے القاب سے نئی نسل کو گمراہ کیا جارہا ہے۔عیسائیت، یہودیت اور ہندومت کے مشترکہ مشرک خیالات وتعلیمات کے مجموعے سے یہ نظریہ ترتیب دیا گیا ہے جوکہ الومناتی اور ’’فری میسن دونوں نظریات کو بھی لے کر چلتا ہے ۔ یہ ہی استعماری قوتیں جب برصغیر پر حکمران تھیں تو مقامی آبادیوں کو عیسائیت میں داخل کرتی تھیں اب مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے الحاد پرستی کی نئی دنیا متعارف کروائی جارہی ہے۔لیکن کیا کیجیے جمہوریت کے نام پر سول مارشل لاء ، اقتدار کی رسہ کشی، عوام کے لئے مہنگائی اور غربت کا سیلاب جس ملک میں ہو وہاں عام فرد کے لیے اس کی شناخت مسئلہ بنتی جارہی ہے۔ مابعد نوآبادیات کے تحت استعماری قوتیں فرد کی شناخت مٹانے کے لیے کوششیں کررہی ہیں۔فرد کی شناخت اس کا مذہب، اس کی ثقافت، اس کا نام سب تبدیل کیے جارہے ہیں ۔استعماری طاقتوں کا یہ ایجنڈا جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ مل کر اپنے مقاصد کے حصول کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

بوئے آدم زاد

بوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں؟
دیو اس جنگلے کے سنّاٹے میں ہیں
ہوگئے زنجیر پا خود اُن کے قدموں کے نشاں!

یہ وہی جنگل ہے جس کے
مرغزاروں میں سدا

چاندنی راتوں میں وہ بے خوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں اُن کے پاؤں شل ہیں ہاتھ سرد
اُن کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے اُن کا رنگ زرد
ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے بابِ نبرد؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، ژولیدہ شاخوں سے انہیں
ہو گئے ہیں کیسے اُس کی بُو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موم کی تمثال دیو!
۔۔۔ہاں اتر آئے گا آدم زادان
شاخوں سے رات
حوصلے دیوؤں کے مات
(ن م راشد)

نادیہ عنبر لودھی اردو ادب کے افق پر ایک ایسی درخشندہ ستارہ ہیں جن کی تحریروں میں فکر کی گہرائی اور احساس کی تمازت بیک وقت جلوہ گر ہے۔ وہ محض ایک نام نہیں، بلکہ شاعری، نثر نگاری اور صحافت کے سنگم پر ابھرنے والا ایک توانا استعارہ ہیں۔ برطانیہ کے ادبی ایوانوں سے ’ادبی ایوارڈ 2017‘ کی صورت میں پذیرائی پانے والی یہ پاکستانی لکھاری، دیارِ غیر میں اردو زبان و بیان کی شمع روشن رکھنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔a ان کا قلم خواتین کی بے بسی اور بچوں کے حساس مسائل کے لیے وقف ہے، جہاں وہ معاشرتی کرب کو لفظوں کا پیراہن عطا کر کے پاکستان کا ایک روشن اور مثبت چہرہ دنیا کے سامنے لاتی ہیں۔ غزل کی نفاست ہو، نظم کا تسلسل یا رباعی کی اختصاری جامعیت—نادیہ نے ہر صنفِ سخن میں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بطور افسانہ نگار، مترجم اور نقاد، ان کا فن زندگی کے متنوع رنگوں کا احاطہ کرتا ہے۔ "تعاقب میں خواب" کی شعری خوشبو ہو، "گمراہ" کی افسانوی حقیقت نگاری یا "خاکدان" کی ناول نگاری—نادیہ کی ہر تصنیف قاری کو ایک نئے جہاں کی سیر کرواتی ہے۔ اخبار "خبریں مانچسٹر یو کے" کی ریزیڈنٹ ایڈیٹر (پاکستان) کے طور پر ان کی صحافتی خدمات ان کی ہمہ جہت شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

کہکشاں میری خاک سے روشن
میری مٹی سے جگمگایا چاند

قلم کتاب ای پبلشرز
واٹس ایپ نمبر 03010487501